

تاریک کھنڈر
پرویز بلگرامی

پیش لفظ

''تاریک کھنڈر'' میری وہ کہانی ہے جسے میں نے پورا نہیں لکھا۔ اس پُراسرار کہانی کے لکھنے کی ابتدا ایک ایسے شخص نے کی جس کا اردو ادب سے دور دور تک کوئی واسطہ نہیں ہے۔ جمیل احمد نے جب یہ کہا تھا کہ یہ کہانی میں لکھوں گا تو سب مسکرا کر چپ رہ گئے تھے۔ دفتر میں ہر ایک کو حیرانی تھی مگر جب اس کہانی کی پہلی قسط سامنے آئی تو سب حیران رہ گئے کہ ایک ایسا شخص جس نے کبھی کوئی کہانی نہیں لکھی، اس نے اتنی دلچسپ اور طویل کہانی کا آغاز کیسے کر دیا۔ کیا وہ اس کو آخر تک سنبھال سکیں گے؟

مگر جمیل صاحب دیگر کاموں میں ایسے الجھے کہ کہانی لکھنے کے لیے وقت ہی نہ رہا۔ تب اس کہانی کو آگے چلانے کی ذمہ داری مجھ پر ڈال دی گئی۔ میں نے اس الجھی ہوئی کہانی کو کیسے سنبھالا، یہ میں ہی جانتا ہوں۔ میں اپنی اس کوشش میں کہاں تک کامیاب رہا، اس کا فیصلہ تو قارئین ہی کریں گے لیکن یہاں مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ جمیل احمد ایک اچھے قلمکار بن سکتے ہیں۔

کہانی اتنی دلچسپ ہے کہ ایک بار شروع کر کے ختم کیئے بغیر چھوڑنا ممکن نہیں۔ سحر و اسرار کے پردوں میں چھپی اس کہانی میں کالی ماتا کے پجاریوں اور رحمانی طاقتوں میں ہونے والی کشمکش ایسی اعصاب شکن ہے کہ قاری بھی اس کی لپیٹ میں آنے سے بچ نہیں سکتا...... یہ میرا دعویٰ ہے، آزما کر دیکھ لیں۔

پرویز بلگرامی

میرا نام وجاہت علی خان ہے۔ میں مرحوم نواب فراست علی خان کا اکلوتا بیٹا اور نواب زنگی الملک شجاعت علی خان مرحوم کا اکلوتا پوتا ہوں جو کہ قیام پاکستان سے قبل کلکتہ (انڈیا) میں منگھیر نامی اسٹیٹ کے نواب تھے۔

میرے والدین لاہور سے کچھ دوری پر شیخو پورہ میں آباد تھے۔ مگر وہ یہاں آ کر تب آباد ہوئے جب پاکستان آزاد ہوا۔ آزادی کے بعد وہ کن صعوبتوں سے گزرے اس کو بیان کر کے آج بھی میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور اماں کی آنکھوں میں آنسو رکنے کا نام نہیں لیتے۔ اس لیے ان کا تذکرہ کرنا میرے لیے محال ہے۔ میں نے اپنی ابتدائی تعلیم شیخو پورہ اور پھر لاہور سے حاصل کی۔ شعور کی منزلیں طے کرتے ہوئے میں نے اپنی تعلیم مکمل کر لی اور اب بیرون ملک مزید تعلیم کے لیے جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ زندگی پُرسکون تھی۔ اللہ کا دیا ہمارے پاس سب کچھ تھا۔ ماں کو اکیلا چھوڑنا میرے لیے مشکل تھا۔ کیونکہ ہم دونوں کا اس پوری دنیا میں کوئی نہ تھا۔ سوائے چند ملنے والوں کے۔ مگر علم کی راہ میں مشکلات اور تکالیف کو برداشت کرنا مجھے ورثے میں بھی ملا تھا۔

اس دن بھی میں اپنے گھر کے صحن میں بیٹھا مستقبل کے پلان بنا رہا تھا کہ اماں بڑی پریشانی کے عالم میں آئیں۔ ان کے ہاتھ میں ایک پرانا لفافہ تھا۔ میں نے اماں کے چہرے کو دیکھا اور بے اختیار پوچھا۔

''کیا بات ہے اماں؟''

اماں نے قدرے توقف کے بعد کہا۔

''بیٹا! اس لفافے میں تمہارے مرحوم والد کی وصیت ہے۔ انہوں نے مرنے سے قبل مجھے حکم دیا تھا کہ جب تم باشعور اور ذمے دار بن جاؤ تو تمہیں یہ لفافہ دے دیا جائے۔ لو

خود ہی پڑھ لو۔''

میں نے فوراً وہ لفافہ کھولا اور بڑی بے چینی سے اپنے مرحوم والد کی وصیت کو پڑھنے لگا۔ والد صاحب نے کچھ عدالتی کاغذات پر اپنی جائیداد اور دوسرے اثاثے میرے اور اماں کے نام منتقل کیے تھے۔ ان کاغذات کے ساتھ مجھے ان کے ہاتھ کا تحریر کیا ہوا ایک خط بھی ملا۔ خط میں لکھا تھا۔

''پیارے بیٹے وجاہت:

جب تم یہ خط پڑھ رہے ہو گے تو میں شاید اپنے پروردگار کے ہاں پہنچ چکا ہوں گا۔ میں یہ خط اس لیے تحریر کر رہا ہوں کیونکہ میں نے اپنی زندگی میں ایک ذمےداری نہیں نبھائی۔ جو مجھے تمہارے مرحوم دادا نے سونپی تھی۔ اس کی وجہ چند ناگزیر مسائل تھے مگر اب جبکہ مجھے یقین ہے کہ میں زیادہ عرصے زندہ نہ رہ پاؤں گا، مجھے یہ کام تمہیں سونپنا ہے۔ کیونکہ مجھ پر ایک قرض ہے اور باپ کا قرض اتارنا اولاد کی اولین ذمے داری ہوتی ہے۔ میں اس وقت بہت چھوٹا تھا جب پاکستان معرض وجود میں آیا۔ تمہارے دادا نواب شجاعت علی خان منگھیر (انڈیا) کے بڑے نواب تھے اور قیام پاکستان کے لیے کی جانے والی کوششوں میں بھی سرگرم تھے۔ قیام پاکستان کے بعد انہوں نے میرے ساتھ پاکستان آنے کی تیاری کی۔ مجھے پہلے بھیج کر وہ اپنی جاگیر اور دوسرے اثاثوں کو بیچنے کے لیے ٹھہر گئے مگر ہندو بلوائیوں کے وحشیانہ حملوں نے جہاں نہتے مسلمانوں کا قتلِ عام کیا، وہاں نواب شجاعت علی خان جیسی بڑی نامور شخصیات کو بھی ان کی جائیدادوں سے بے دخل کر دیا۔ تمہارے دادا بمشکل اپنی جان بچا کر پاکستان پہنچے اور زیادہ عرصہ حیات نہ رہے۔ مگر مرنے سے پہلے مجھے ایک ایسی ذمے داری سونپ گئے جو کہ میرے بعد صرف اور صرف تم ہی انجام دو گے۔ کیونکہ میں اپنی سرکاری ذمے داریوں کی بنا پر کبھی انڈیا نہ جا سکا مگر اب تمہیں وہاں جا کر اپنے اجداد کا یہ فرض نبھانا ہے۔

انڈیا میں تاراپور کے قریب منگھیر نامی اسٹیٹ میں ہماری آبائی حویلی تھی۔ اس حویلی میں تمہارے دادا شجاعت علی خان کے بیڈروم میں ایک تہہ خانہ تھا۔ جب تمہارے دادا ہندو بلوائیوں کی وجہ سے جان بچاتے ہوئے حویلی سے نکلے تو نہایت قیمتی نوادرات جو پچھلے سات سو برس سے ہمارے اجداد کی نشانی کے طور پر نسل در نسل محفوظ تھے۔ انہیں تہہ خانے میں رکھ آئے۔ ان تمام نوادرات میں سب سے اہم اور سب سے قیمتی وہ مقدس یاقوتی نگینے والی انگوٹھی ہے جو ایک درویش خدا نے آج سے تقریباً چار سو برس قبل ہمارے خاندان کے جدامجد کو بخشی تھی کیونکہ اس زمانے میں کالےعلم اور سفلی عوامل اپنے عروج پر تھے۔ ہندو بدذات کالی ماں کی پوجا کر کے انتہائی غلیظ عوامل سے مسلمانوں کو زچ کرتے تھے اور اس کا توڑ مسلمانوں نے اپنے اولیا کرام سے حاصل کیا۔ اس مقدس انگوٹھی کو پہن کر ہمارے آباؤ اجداد نے نہ صرف اپنے آپ کو سفلی عوامل اور کالے علم کے پھندوں سے محفوظ رکھا بلکہ ان کے خلاف بہت مؤثر جہاد بھی کیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان عوامل کو کرنے والوں کا ایک بڑا گروہ ہمارے خاندان کے پیچھے پڑ گیا۔ وہ لوگ اب تک اس تاک میں تھے کہ ہماری نسلوں کو مٹا دیں مگر اس مقدس انگوٹھی پہننے والے کی سات نسلوں تک کوئی بھی سفلی عمل بے کار تھا اس لیے ہم محفوظ رہے مگر میرے بیٹے، ان سات نسلوں میں تم آخری نسل ہو اور تمہارے بعد کی نسلوں پر یہ خدا کے وجود کے منکر شیطان کے پجاری کسی بھوکے بھیڑیوں کی طرح حملہ آور ہوں گے۔ یہ مت سمجھو کہ وہ تم سے بہت دور ہیں بلکہ وہ شیطانی عوامل کے ماہر ہر وقت تمہاری تاک میں ہیں۔ تم تو ان سے محفوظ ہو مگر تمہاری اولاد اور پھر ان کی اولاد ان کے شیطانی حربوں سے محفوظ نہیں۔ اس کا ایک ہی حل ہے کہ تم اپنے آباؤ اجداد کی حویلی میں موجود تہہ خانے سے کسی طرح وہ انگوٹھی حاصل کر کے پہن لو۔ چالیس دن تک مسلسل انگوٹھی پہنے رکھنے سے تمہاری بھی سات نسلیں محفوظ ہو جائیں گی۔

اور ہاں انڈیا پہنچ کر پہلی فرصت میں حضرت نظام الدین اولیاؒ کے مزار پر حاضری دینا کیونکہ ہمارے جدامجد ان کے عزیز ترین مریدین میں سے تھے۔ مجھے امید ہے کہ میرا بہادر بیٹا اپنے مرحوم باپ کے قرض اور ذمے داری کو ہر حال میں پورا کرے گا۔ اللہ تمہارا حامی و ناصر ہو۔

فقط تمہارا والد

خط پڑھ کر میں حیران و پریشان ہو گیا میری سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیتیں جواب دے گئیں۔ اماں نے مضطرب ہو کر پوچھا۔

''کیا بات ہے؟''

میں نے خط انہیں تھما دیا جسے پڑھ کر وہ بھی سکتے میں آ گئیں پھر قدرے توقف کے بعد بولیں۔

''ہاں بیٹے، تمہارے مرحوم والد نے کئی دفعہ ان عجیب واقعات کا تذکرہ کیا تھا جو بچپن میں ان کے ساتھ پیش آئے اور مجھے جلد ہی معلوم ہو گیا کہ شیطانی عوامل کا ماہر ایک گروہ ہمارے خاندان کی تاک میں ہے مگر میں نے یہ باتیں ہمیشہ تم سے چھپائیں تاکہ تم کہیں ڈر نہ جاؤ ویسے بھی تم نئی نسل کے بچے ہو ان چیزوں پر شاید یقین نہ کرتے۔ اس لیے میں نے انتظار کیا کہ جب تم بالغ اور باشعور ہو جاؤ تو تمہیں تب ہی تمہارے والد کا یہ خط دوں جو انہوں نے پانچ برس قبل مرنے سے کچھ دن پہلے لکھ کر مجھے دیا تھا اور مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ میں تمہیں اس ذمے داری کو پورا کرنے سے ہرگز نہ روکوں۔ اس لیے بیٹے سوچنے میں وقت ضائع مت کرو۔ تم اپنے آباؤ اجداد کی حویلی کو ڈھونڈو کیونکہ قیام پاکستان کے بعد پوری حویلی کو جلا کر ڈھا دیا گیا تھا اور اب تو وہ کھنڈرات کی صورت ہے۔ پتا نہیں کیوں کوئی وہاں آباد نہ ہو سکا۔ بقول کچھ لوگوں کے جن سے تمہارے مرحوم والد کی ٹیلی فون پر بات ہوئی تھی کہ وہاں پر جنات کا بسیرا ہے۔ خیر میرے بچے تم ان سب چیزوں سے محفوظ ہو۔ اس لیے بے خطر وہاں چلے جاؤ اور اپنے مرحوم باپ کی وصیت کو پورا کر دو۔''

ماں کی باتوں سے مجھے حوصلہ ملا اور اگلے چند دنوں میں میں نے اپنا ویزا لگوا کر رختِ سفر تیار کر لیا۔

☆======☆======☆

ٹرین دہلی کی جانب رواں دواں تھی۔ لاہور بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ فرسٹ کلاس کے کوپے میں میرے ساتھ ایک ہندو فیملی تھی جو دو عمر رسیدہ خواتین اور ایک جوان لڑکی پر مشتمل تھی۔ لڑکی کا نام شانتی تھا۔ کیونکہ دونوں خواتین اسے کبھی کبھی اسی نام سے پکار رہی تھیں اور وہ شاید ان میں سے کسی ایک عورت کی بیٹی تھی۔ پورے راستے میں خاموش پڑا رہا اور اس فیملی سے کوئی بات چیت نہ ہوئی وہ لوگ بھی اپنی باتوں میں ہی محو رہے۔ اٹاری کے اسٹیشن پر یہ لوگ اتر گئے۔ گاڑی کچھ دیر بعد دوبارہ چل دی۔ میں جس ڈبے میں سوار تھا۔ وہ بالکل خالی ہو گیا۔ میں نے بھی سکون کا سانس لیا اور اپنی سیٹ پر دراز ہو گیا۔ ٹرین چلتی رہی۔ رات کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ میں نے ٹفن میں سے قیمے کے پراٹھے نکالے جو اماں نے روانگی کے وقت مجھے دیے تھے۔ میں کوک کے کین کے ساتھ محو خوراک ہو گیا۔ کھانے سے فرصت کے بعد میں نے والد مرحوم کا خط نکال کر دوبارہ پڑھا۔ پتا نہیں کیوں مجھے ایسے لگ رہا تھا کہ جیسے ابو آس پاس ہی ہوں اور بے چین ہوں۔ ان کے خط کو پڑھ کر میں بھی بے چین ہو گیا تھا اور ان کی وصیت کو جلد از جلد پایۂ تکمیل تک پہنچانا چاہتا تھا۔ مستقبل کے پلان بناتے بناتے گہری نیند سو گیا۔

میری آنکھ اچانک ٹرین کے رکنے سے کھلی۔ میں نے گھڑی میں وقت دیکھا تو رات کے تین بجے تھے۔ شیڈول کے مطابق دلی اسٹیشن ابھی تقریباً چار گھنٹے دور تھا۔ میں نے کھڑکی کے شیشے میں سے باہر جھانکا۔ تو صرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ شاید ٹرین کسی چھوٹے سے اسٹیشن پر رکی تھی جو کہ بہت ویران ہو گا کیونکہ باہر مکمل اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ اچانک میرے کوپے کے دروازے پر دستک ہوئی۔ میں چونک پڑا۔ دستک دوبارہ ہوئی اور ساتھ ہی ٹکٹ چیکر کی آواز آئی۔

''ٹی ٹی''

میں نے دروازہ کھولا تو سامنے ٹی ٹی کھڑا تھا۔

''یہ بھی بھلا کوئی وقت ہے ٹکٹ چیک کرنے کا۔'' میں بڑبڑایا۔

ٹی ٹی نے فوراً جواب دیا۔

''صاحب یہ لوگ آپ کے ڈبے میں سفر کریں گے۔'' میں نے باہر جھانک کر دیکھا تو ایک گھونگھٹ پوش عورت ایک سادھو نما ہندو بزرگ کے ساتھ کھڑی تھی۔ بھلا میں کیا

اعتراض کرتا۔ ملک پرایا، ٹرین پرائی اوپر سے لوگ بھی پرائے۔ ایسے میں مجھے کوئی حق نہیں تھا کہ شکایت کرسکتا۔ میں نے ان کے لیے راستہ چھوڑا اور اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔ انہیں بٹھانے کے بعد ٹی ٹی چلا گیا۔

میں حیران تھا کہ اس قدر رات گئے یہ لوگ کیوں سفر کر رہے ہیں۔ پھر میں نے اپنی اس بھونڈی سوچ سے سر جھٹکا اور سونے کی تیاری کرنے لگا مگر نیند اب آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ دونوں مسافر جو شاید باپ بیٹی تھے۔ میرے سامنے والی سیٹ پر خاموشی بیٹھے مجھے دیکھ رہے تھے۔ مجھے ان کے اس طرح دیکھنے سے بڑی کوفت ہوئی اچانک وہ سادھو بولا

''بیٹے کہاں سے آرہے ہو؟''

میں نے فوراً مودب ہو کر جواب دیا۔ ''جی پاکستان سے۔''

''اچھا تو مسلمان ہو۔'' بوڑھے نے الفاظ کو چباتے ہوئے پوچھا۔

''جی!'' میں نے بھی مختصراً جواب دیا۔

''کہاں جا رہے ہو۔'' وہ پھر پوچھنے لگے۔

''جی تاراپور کے قریب منگھیر نامی اسٹیٹ جا رہا ہوں۔ وہاں کچھ عزیز ہیں ہمارے۔''

''اچھا مگر تاراپور کے آس پاس کے علاقوں میں تو شاید ہی کوئی مسلمان ہو کیونکہ تاراپور اور اس کے تمام مضافات ہندو اکثریتی آبادی ہے اور وہاں کے ہندو تو اپنی انتہا پسندی کے لیے مشہور ہیں۔ پچھلے سال ایک مسلمان خاندان غلطی سے وہاں رہنے کے لیے پہنچ گیا۔ تو وہاں کے چند سرگرم نوجوانوں نے مسلمان مردوں کو زندہ جلا دیا اور لڑکیوں کی عصمت دری کی۔ وجہ گجرات میں ہندو مسلم فسادات تھے۔ جن کا غبار اس بے چارے خاندان پر اتارا گیا۔'' ہندو سادھو نے جب اپنی بات ختم کی تو میں نے گھبرا کر پوچھا۔

''مگر باباجی میں تو وہاں ضرور جاؤں گا وہاں میرے خاندان کی امانتیں ہیں، جن کو پانا بہت ضروری ہے۔''

بوڑھا بڑی شفقت سے بولا۔ ''دیکھو بیٹا زندگی سے بڑھ کر عزیز کوئی چیز نہیں۔ ابھی تک ہندوستان میں ہندو مسلم فسادات کی فضا گرم ہے۔ ایسا نہ ہو کہ تم اپنا بڑا نقصان کر ڈالو۔ ویسے بھی تم نئے ہو اس لیے فوراً دھر لئے جاؤ گے۔ میری مانو تو دلی سے واپسی اختیار کر لو۔''

مجھے اس ہندو سادھو کی باتوں میں خلوص نظر آیا اس لیے میں نے سوچا کہ اس سے مدد طلب کی جائے۔ اس لئے میں نے فوراً بابا سے عاجزانہ لہجے میں کہا۔

''بابا آپ ہی میری مدد کریں۔ منگھیر میں میرے آباؤ اجداد کی حویلی ہے۔ مجھے وہاں سے کچھ خاندانی نوادرات لانے ہیں۔ اس کے فوراً بعد میں چلا جاؤں گا۔ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کو اچھا خاصا معاوضہ بھی دوں گا مگر آپ پلیز میری مدد کریں۔''

بوڑھا خاموش ہو گیا۔ پھر کن اکھیوں سے اس نے اپنی بیٹی کو گھورا اور اچانک مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''ٹھیک ہے مگر اس کے لیے ایک شرط ہے کہ تم کسی کو یہ نہ بتانا کہ تم مسلمان ہو یا پاکستان سے آئے ہو۔'' میں نے فوراً ہامی بھر لی کیونکہ مجھے اندازہ تھا کہ میری مدد کر کے وہ لوگ بھی مشکل میں پھنس سکتے تھے۔ بوڑھا مجھ سے پھر مخاطب ہوا۔

''بیٹے تم اگلے اسٹیشن پر ہمارے ساتھ اتر جانا کچھ فرلانگ پر ہمارا گاؤں ہے۔ وہاں پہنچ کر ہی میں تمہارے لیے کچھ کر سکتا ہوں۔''

میں مرتا کیا نہ کرتا فوراً ہامی بھر لی اور اسٹیشن آنے کا انتظار کرنے لگا۔ صبح کے ساڑھے چار بج رہے تھے۔ کچھ دیر بعد ٹرین کی رفتار کم ہونے لگی اور پھر ٹرین ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر رک گئی۔ سادھو نے اپنا سامان اٹھایا اور مجھے ساتھ چلنے کو کہا میں ان کے پیچھے چل پڑا۔ اسٹیشن پر اترتے ہی مجھے شدید سردی کا احساس ہوا۔ میں نے فوراً اپنی چمڑے کی جیکٹ نکال کر پہن لی۔ ٹرین کچھ دیر رکنے کے بعد چل پڑی تھی۔ میں، سادھو بابا اور اس کی بیٹی اسٹیشن سے باہر نکل آئے تھے۔ اسٹیشن کا نام چونکہ ہندی میں لکھا تھا۔ اس لیے مجھے اندازہ نہ ہو سکا کہ اس جگہ کا کیا نام تھا۔ ہم تینوں خاموشی سے اسٹیشن سے باہر نکل کر ایک جانب چل پڑے۔ ابھی تک نہ میں نے سادھو بابا کی بیٹی کا چہرہ دیکھا تھا نہ میں نے اس آواز کی سنی تھی۔ وہ اپنے باپ کے ساتھ ساتھ گھونگھٹ ڈالے چل رہی تھی۔ میں ذرا سا پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ چاروں طرف گہرا اندھیرا تھا۔ بس چاند کی ہلکی ہلکی روشنی ہمیں راستہ دکھا رہی تھی۔ سادھو بابا اور اس کی بیٹی بہت تیز چل رہے تھے اور میں بار بار تقریباً بھاگ کر ان کا ساتھ دے رہا تھا۔ مجھے حیرت تھی کہ یہ لوگ اتنا تیز کیسے چل لیتے ہیں۔ خیر خاموشی سے اس لیے بھی اس کے ساتھ چلتا رہا کہ پردیس کے طور طریقوں سے واقف نہ تھا۔

ہم آگے پیچھے چلتے رہے۔ وہ آگے آگے اور میں پیچھے، اچانک چاند کی مدھم روشنی

میں میری نظر سادھو بابا کی بیٹی کی ٹانگوں پر پڑی۔ تو مجھے وہ کچھ عجیب سی لگیں۔ میں آنکھیں کھول کھول کر ذرا غور سے انہیں دیکھنے لگا اور پھر اچانک مجھے ایک کرنٹ سا لگا مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ سادھو کی بیٹی کے پاؤں پیچھے کی جانب تھے اور وہ آگے کی جانب چل رہی تھی۔ اچانک میری نظر ذرا اٹھی تو جیسے میرے بدن میں بھونچال آ گیا ہو۔ اس لڑکی کا چہرہ میری جانب تھا اور وہ اسی طرح آگے کو چل رہی تھی اندھیرے میں اس کی لال انگارہ آنکھیں میرے جسم میں خوف کی ایک سرد لہر دوڑا گئیں۔ میں فوراً رک گیا اس سے پہلے کہ میں کچھ سوچتا سادھو نے چلتے چلتے اپنی گردن 180 ڈگری کے زاویے میں موڑ کر مجھے گھورا اور بہت سرد لہجے میں بولا۔ ''رکو مت چلتے رہو ہمارے ساتھ، اگر رک گئے تو جان سے جاؤ گے۔''

مگر میری ہمت جواب دے گئی۔ خوف کے مارے پاؤں بھاری ہو گئے۔ میں نے پیچھے بھاگنا چاہا مگر لگ رہا تھا کہ ایک ایک پاؤں من من بھر کا ہو گیا ہے۔ بڑی مشکل سے جیسے ہی پیچھے کی جانب بھاگنے کے لیے مڑا۔ سادھو اور اس کی چڑیل نما بیٹی سامنے کھڑے اپنی خونخوار آنکھوں سے مجھے گھور رہے تھے۔ پھر میرے دیکھتے دیکھتے ہی ان دونوں کے قد بڑھنے لگے۔ مجھ پر طاری خوف میرے دل کی دھڑکن کو کسی میوزک ڈرم کی طرح بجا رہا تھا۔ سخت سردی کے موسم میں بھی جسم پسینے سے شرابور ہو چلا تھا۔ موت کو اور وہ بھی اتنی خوف ناک موت کو میں اپنے بہت قریب دیکھ رہا تھا وہ دونوں جن نما انسان شعلہ بار نگاہوں سے مجھے گھور رہے تھے سادھو پھر غرا کر بولا۔ ''ہمارے ساتھ چلتے رہو ورنہ ابھی تمہیں بھسم کر دیں گے۔''

میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ ''تم کون ہو۔ کیا چاہتے ہو؟'' اس بار وہ ڈائن غرا کر بولی۔

''خاموش رہو ورنہ زبان کھینچ ڈالوں گی چپ چاپ چلتے رہو۔''

''مم...... مگر تم ہو کون؟'' میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھ ہی ڈالا۔

اس بار سادھو نما جن نے اپنی لمبی گردن میرے چہرے کے قریب لا کر بڑے خونخوار انداز میں کہا۔

''ہم تو برسوں سے تمہارے دادا اور باپ کے منتظر تھے۔ مگر آیا بھی تو کون؟ یہ سہما ہوا سا بچہ۔ جاننا چاہتے ہو کہ ہم کون ہیں! تو سنو۔ ہم تمہاری سات نسلوں سے تمہارے خاندان

کے ازلی دشمنوں میں سے ہیں۔ تمہارے جدامجد نے جس طرح ہم شیطان کے پجاریوں کو زچ کیا، اس طرح ہم بھی تمہاری نسلوں کے درپے ہیں۔ مگر افسوس کہ تمہاری سات نسلیں اس بوڑھے درویش کی کرامت سے محفوظ رہیں۔ اب جبکہ تم پھر سے اپنے جدامجد کی طرح اس کرامت والی انگوٹھی کو پہن کر ہمارے گرو کو پریشان کرو ہم نے پہلے ہی تمہیں تمہاری منزل سے دور کر ڈالا۔ تم خوش قسمت ہو کہ درویش بابا کی کرامت کی بنا پر اب تک زندہ ہو ورنہ کالی دیوی کب کی تمہارے گرم گرم خون کو تمہاری ہڈیوں سے چاٹ چکی ہوتی مگر تم اب بھی ہماری قید میں ہو۔ تم کبھی بھی اپنی منزل کو نہ پہنچ پاؤ گے۔ ہم منتظر ہیں۔ تمہاری اگلی نسل کے آنے کے اور پھر تم خود دیکھنا کہ کس طرح ہم تمہاری اگلی نسل کے شیرخواروں کا گرم گرم خون چاٹ چاٹ کر تم لوگوں سے اپنا انتقام لیں گے۔'' اتنا کہہ کر وہ قہقہہ لگانے لگا اور پھر چاروں طرف سے قہقہے سنائی دینے لگے اور وہ دونوں شیطان میرے چاروں طرف کسی پرندے کی طرح منڈلانے لگے۔ میں نے آنکھیں موند لیں اور پھر آیت الکرسی کا ورد شروع کر دیا۔ گھبراہٹ کے مارے میری زبان تک لڑکھڑا رہی تھی۔ اچانک مجھے اپنے اندر میرے مرحوم والد کی سرگوشی سنائی۔

''وجاہت بیٹے! ڈرو مت۔ یہ لوگ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ تم محفوظ ہو۔ یہ تو صرف تمہارا وقت ضائع کر رہے ہیں۔ تمہیں تمہاری منزل سے دور کر رہے ہیں۔ اسم اعظم کا ورد کرو اور ان پر پھونک دو۔''

اور اگلے لمحے میں نے دل ہی دل میں اسم اعظم کا ورد کیا اور آنکھیں کھولتے ہی اپنے چاروں طرف پھونک کر حصار بنا لیا۔ یہ کرنا تھا کہ ان دونوں کے قہقہے، چیخوں اور چنگھاڑوں میں بدل گئے۔ میں نے دیکھا کہ آگ کا ایک ہیولا ان دونوں کے گرد لپٹا ہوا تھا اور وہ دونوں شیطانی مخلوق بری طرح چنگھاڑ رہی تھیں۔ پھر اچانک ایک زور کا دھماکا ہوا اور میں جیسے بے ہوش ہو کر گرا۔

☆======☆======☆

جب میری آنکھ کھلی تو میں ٹرین کے فرسٹ کلاس کوپے میں ہی اپنی سیٹ پر دراز تھا۔ دن نکل چکا تھا اور باہر آبادی کے آثار نظر آ رہے تھے۔ میں نے رات کے واقعے کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ پہلے تو میں سمجھا کہ یہ سب وہم تھا اور شاید کوئی ڈراؤنا خواب تھا مگر

اچانک میری نظر اپنی لیدر جیکٹ پر پڑی جو میں نے پہنی ہوئی تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ سونے سے پہلے تو یہ جیکٹ میرے بیگ میں تھی۔ پھر کب نکالی۔ ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ نظر جوتوں پر پڑی تو وہ مٹی سے اٹے ہوئے تھے جبکہ میں تو ٹرین سے اترا ہی نہ تھا اور پھر مجھے رات والے واقعے کا ایک ایک لمحہ یاد آنے لگا۔ میں نے خوف سے ایک جھرجھری لی اور پھر اسم اعظم کا ورد شروع کر دیا۔ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ میں جس مقصد کے لیے رواں تھا اس میں کافی رکاوٹیں تھیں۔ مگر مجھے پھر بھی کامل یقین تھا کہ کوئی بھی شیطانی مخلوق یا سفلی عمل میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ مگر یہ سب کچھ صرف مجھ تک ہی محدود تھا میرے بعد میرے بچے اور پھر ان کے بچے ان شیطانی چیلوں سے محفوظ نہ تھے اور جس طرح میرے جدامجد نے ہمیں محفوظ کرنے کے لیے ان شیاطین کے خلاف جہاد کیا مجھے بھی اپنی آنے والی نسلوں کے لیے کچھ ایسا ہی کرنا تھا۔

☆======☆======☆

دلی کا اسٹیشن آ چکا تھا۔ ٹرین سے اترتے ہی کسٹم حکام نے ہمارے سامان کی تلاشی لی۔ اگرچہ اٹاری کے اسٹیشن پر بھی ہماری چیکنگ ہوئی تھی مگر یہاں شاید بڑی تفصیل سے چیکنگ ہونا تھی۔ کیونکہ ہم سب پاکستانیوں کو ایک طرف قطار میں کھڑا کر کے نہ صرف ہمارے سامان کی تلاشی لی جا رہی تھی بلکہ ہمارے جامہ کی تلاشی بھی ساتھ ساتھ ہو رہی تھی۔ ایک طرف کسٹم حکام کے دو تربیت یافتہ کتے بھی تھے۔ ایک پاکستانی بزرگ کی چیکنگ کی باری آئی تو ایک کٹر ہندو کسٹم آفیسر نے اپنے تربیت یافتہ کتے کو آگے بڑھا کر ان کو سونگھایا اور ساتھ بڑے بھونڈے انداز میں بولا۔ ''ارے پاکستانی مُسلے کو ہم کیوں ہاتھ لگائیں۔ سالا کتا پالا ہی ان کی تلاشی کے لیے ہے۔'' دوسرے کسٹم افسروں نے بھی ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ میرا دل چاہا کہ ایک زوردار تھپڑ اس کے رسید کر دوں کہ جب ہمارے ہاں ہندوستان سے کوئی ہندو یا سکھ آتے ہیں تو ہم ان کی آؤ بھگت میں پیش پیش رہتے ہیں مگر یہ لوگ اپنے ملک میں آنے والے پاکستانیوں سے کتنا ذلت آمیز سلوک کر رہے تھے۔ خیر زبان کو بند رکھنا ہی مناسب سمجھا۔ کچھ دیر بعد میری باری آ گئی۔ میری جامہ تلاشی کے ساتھ ساتھ میرے سامان کی بھی چیکنگ کی گئی۔

''اوہ میرے خدا۔'' میرے منہ سے اچانک نکلا۔ کیونکہ میرے بیگ میں سے کسٹم

حکام کو ایک نومولود بچے کی لاش' خون سے لت پت ملی۔ میں اپنی صفائی میں کچھ بھی نہ کہہ سکا، کیا کہتا۔ یہ یقیناً کسی شیطانی عمل کا نتیجہ تھا۔ میں نے فوراً اسم اعظم کا ورد شروع کر دیا اور خیال ہی خیال میں اپنے آپ کو اگلے کئی برسوں تک انڈین جیل میں سڑتا ہوا دیکھنے لگا۔ مگر جب کافی دیر تک مجھ سے کوئی پوچھ گچھ کرنے والا نہ آیا تو میں نے بڑی حیرت سے دائیں بائیں دیکھا مگر مجھے کوئی بھی نہیں دیکھ رہا تھا اور ایک افسر نے مسکراتے ہوئے میرا بیگ میرے حوالے کرتے ہوئے مجھے آگے بڑھ جانے کو کہا۔ میں حیرت کا بت بنا آگے بڑھ گیا پھر اچانک میں نے اپنا بیگ کھول کر چیک کیا تو اس میں کسی نومولود کی لاش یا خون وغیرہ کے دھبے کا کوئی نام ونشان تک نہ تھا۔ میں نے رب کا شکر ادا کیا وہ ذات برابر میری مدد کر رہی تھی۔ ابھی چند قدم آگے ہی بڑھا تھا کہ ایک میلا کچیلا فقیر اچانک میرے سامنے آ گیا اور اپنے پیلے پیلے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے بولا۔ ''حق ہو حق ہو اللہ ہو، چلتے رہو، بڑھتے رہو، اگر ڈرو گے، تو مرو گے، چل میرے مرشد نے تجھے یاد کیا ہے کوتاہی مت کرنا۔ اپنے بزرگوں کی ہی راہ پر چلنا۔ تم محفوظ رہو گے مگر مرشد سائیں کے در پر حاضری ضرور دینا۔ حق ہو، حق ہو اللہ ہو، جو ڈرے گا، تو مرے گا، حق ہو۔''

اتنا کہہ کر وہ فقیر چوکڑیاں بھرتا ہوا غائب ہو گیا اور میں سوچنے لگا کہ اس فقیر کا پیغام بہت اہم تھا مجھے والد مرحوم نے بھی وصیت کی تھی کہ انڈیا پہنچتے ہی سب سے پہلے حضرت نظام الدین اولیاؒ کے دربار پر حاضری دینا ہے۔ اس لیے میں نے تہیہ کیا کہ سب سے پہلے حضرت نظام الدین اولیاؒ کے دربار پر حاضری دی جائے اسی ارادے سے میں نے اسٹیشن کے باہر سے ایک ٹیکسی پکڑی اور مزار کی جانب روانہ ہو گیا۔

☆======☆======☆

کافی دیر سفر کرنے کے بعد رات گئے میں دربار پر پہنچا۔ ٹیکسی والے کو کرایہ ادا کیا۔ اسے ٹھہرنے کا کہہ کر میں دربار کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ جوں جوں میں حضرت کے مزار کی سیڑھیاں چڑھتا جا رہا تھا۔ میرے اردگرد کا ماحول تبدیل ہوتا جا رہا تھا اور پھر جونہی میں نے مزار کے احاطے میں قدم رکھا، میں سکتے میں آ گیا۔ سامنے ستون کے ساتھ میرے والد مرحوم اور دادا مرحوم کھڑے نظر آئے۔ وہ مجھے بہت قابل ستائش نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ سوچتا یا سمجھتا انہوں نے مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور

دربار کے اندر چلے گئے۔ میں تیز قدم اٹھاتا ہوا ان کے پیچھے ہولیا اور جیسے ہی مزار کے اندر داخل ہوا تو حیران رہ گیا۔ مجھے ایسا لگا جیسے میں کسی پُرنور سی جگہ پر آگیا ہوں۔ سامنے لکڑی کے ایک چھوٹے تخت پر بہت ہی نورانی صورت والے بزرگ تشریف فرما تھے۔ جبکہ ان کی دونوں جانب بہت سے باوقار اور نورانی صورتوں والے حضرات تشریف فرما تھے۔ میرے والد مرحوم اور دادا مرحوم بھی خاموشی سے ان کے دائیں جانب کھڑے ہو گئے اور اشارے سے مجھے آگے بڑھنے کو کہا۔ میں بڑے احتیاط اور ادب سے آگے بڑھنے لگا کہ معاملہ میری سمجھ میں آچکا تھا اور پھر بڑے احترام سے میں ان نورانی صورت بزرگ کے سامنے دوزانو بیٹھ گیا اور مؤدب ہو کر ''اسلام علیکم ورحمتہ اللہ'' کہا۔ بزرگ نے میرے سلام کا جواب دیا اور پھر یوں گویا ہوئے۔

''وجاہت میاں! اللہ کا تم پر خاص کرم ہے کہ اس ذات کامل نے تمہیں ان شیطان کے چیلوں کے خلاف جہاد کے لیے چنا، دین اسلام راہ حق پر چلنے والوں کا مذہب ہے اور راہ حق میں لڑنے والے اللہ کے سپاہی ہیں۔ تم یہ جہاد صرف اپنی نسل کو بچانے تک ہی محدود مت رکھنا بلکہ اس خطے کے راہ حق پر چلنے والوں کو بھی ان شیطانوں کے ناپاک حربوں سے بچانے کے لیے جہاد کرنا۔ اس منزل کے حصول میں بہت کٹھن مراحل ہیں مگر جاؤ میں تمہیں اللہ تبارک وتعالیٰ کے سپرد کرتا ہوں۔ وہی تمہاری حفاظت کرے گا، مگر یاد رکھنا شیطان تمہیں طرح طرح کے طریقوں سے بہلائے گا، بہکائے گا اور تمہیں تمہاری منزل سے دور کرے گا لیکن اگر تم نے اپنے نفس کو قابو میں رکھا تو ضرور کامیاب ہو گے۔ اب تم جا سکتے ہو اللہ نگہبان۔''

اتنا کہہ کر وہ بزرگ اور ان کے گرد سب لوگ اچانک میری آنکھوں کے سامنے دھندلا گئے اور پھر اچانک غائب ہو گئے اور پھر احاطے میں صرف ایک بڑی قبر جو ا درویش خدا کی تھی، موجود تھی۔ میں نے فاتحہ پڑھی اور بہت دیر تک گڑگڑا کر اللہ کی مدد کی کی۔ اپنے جد امجد کے لیے دعا کی اور واپس نکل پڑا۔ سیڑھیاں اترتے ہوئے اچانک میرا پاؤں کسی سے ٹکرایا اور ایک انسانی آواز سنائی دی۔ ''حق ہو اللہ ہو'' میں فوراً آواز پہچان گیا۔ یہ اسی فقیر کی آواز تھی جو اسٹیشن پر مجھے ملا تھا۔ میری ٹھوکر سے وہ بھی جاگ اٹھا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ مسکرایا اور قدرے پُرسکون انداز میں بولا۔

''اچھا ہوا جو تم آگئے، مرشد بہت دنوں سے تمہارے منتظر تھے۔ جاؤ اب وقت ضائع مت کرو اور ہاں یہ تسبیح رکھ لو۔'' سبز رنگ کی ایک تسبیح اس فقیر نے میری طرف بڑھائی اور بولے۔ ''اسے رکھ لو۔ ذکر خدا کے کام آئے گی اور بوقت مصیبت نکال کر تسبیح کر لینا انشاء اللہ سکون ملے گا۔'' میں نے فقیر کا شکریہ ادا کیا اور سیڑھیاں پھلانگتا نیچے آگیا۔

ٹیکسی والا ٹیکسی کے اندر ہی سو رہا تھا۔ میں نے اسے جگایا تو بڑے ناگوار انداز میں اٹھتے ہوئے بولا۔ ''صاحب اتنی دیر کیا۔ ہم اس کا بھی پیسہ لے گا۔''

''ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔'' میں نے بھی فوراً جان چھڑاتے ہوئے کہا۔

اس نے ٹیکسی اسٹارٹ کی اور تقریباً تیس منٹ کی ڈرائیو کے بعد ہوٹل مہاراج انٹرنیشنل کے پورچ میں ہماری ٹیکسی رکی۔ میں نے اس کا کرایہ ادا کیا اور بطور انعام اسے دس ڈالر مزید ادا کیے اور ساتھ ہی اسے اگلی صبح آٹھ بجے آنے کا حکم صادر کر دیا۔ وہ دس ڈالر کا انعام پا کر جیسے سکتے میں آگیا۔

دونوں ہاتھ جوڑ کر فوراً بولا۔ ''صاحب ہم تو صبح چھ بجے ہی پہنچ کر آپ سرکار کا انتظار کرے گا۔''

میں نے سامان اتروا کر ہوٹل کے اسٹیشن پر رکھوایا اور کمرے کے حصول کے لیے ضروری اندراج کرنے لگا۔ معمول کے اندراج کے بعد مجھے کمرہ نمبر تیرہ الاٹ کر دیا گیا ایک بوڑھا سا ویٹر سامان اٹھا کر کمرے تک ساتھ آیا۔ کمرے میں سامان رکھ کر وہ ایک جانب کھڑا ہو گیا میں فوراً سمجھ گیا کہ اسے ٹپ کی امید تھی اس لیے میں نے اسے پانچ ڈالر کا ایک نوٹ تھما دیا۔ اس نے فوراً اپنے پیلے دانتوں کی نمائش کی اور ہاتھ جوڑ کر بولا۔ ''سرکار کوئی وہسکی سسکی کا موڈ ہو تو حکم کریں۔'' میں نے فوراً انکار کر ڈالا۔ پھر وہ دھیرے سے بولا۔ ''سرکار دیسی، ولایتی، بہاری، مراٹھی، دکنی، مسلمان، ہندو ہر قسم کی لونڈیا موجود ہے۔ سرکار حکم فرما دیں تو ابھی حاضر کرواؤں۔''

میں نے قدرے ناگواری سے اسے دیکھا اور انکار کر دیا۔ وہ ہاتھ جوڑے کمرے سے نکل گیا۔ میں نے دروازہ لاک کر کے باتھ روم کا رخ کیا شاور لے کر میں باہر نکلا تو دنگ رہ گیا۔ ایک نہایت خوبصورت مشرقی خدوخال والی نوجوان لڑکی میرے کمرے میں موجود تھی۔ حلیے سے وہ ہرگز کوئی طوائف معلوم نہیں ہوتی تھی۔ اس نے چست نیلی جینز

اور ہلکے گلابی رنگ کی شرٹ پہن رکھی تھی۔ پاؤں میں چپل تھی۔ جبکہ پاؤں کی انگلیوں تک میں انگوٹھیاں نمایاں تھیں۔ اس کے بال شاید زیادہ لمبے نہ تھے۔ اس لیے اس نے بالوں کا جوڑا بنا رکھا تھا۔ ہونٹوں پر ہلکے شیڈ کی لپ اسٹک اور آنکھوں کے میک اپ نے اسے سحرانگیز حد تک جاذب نظر بنا ڈالا تھا۔ میں کچھ دیر تو اسے ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا پھر اچانک ہڑبڑا گیا اور اس حسینہ سے پوچھا۔

''جی فرمائیے آپ یہاں کیسے؟''

وہ کچھ دیر میری آنکھوں میں مسکرا کر دیکھتی رہی پھر دھیرے سے بولی۔ ''میرا نام روحانہ عثمان ہے۔ کراچی سے انڈیا آئی ہوں۔ استقبالیہ پر پتا چلا کہ ایک پاکستانی اسٹوڈنٹ کمرا نمبر تیرہ میں آکر ٹھہرا ہے تو ملنے چلی آئی۔ آپ کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اس لیے بغیر اجازت کے اندر چلی آئی۔''

اتنا کہہ کر وہ مسکرانے لگی۔ وہ صحیح کہہ رہی تھی میں نے استقبالیہ پر اپنا پیشہ اسٹوڈنٹ ہی لکھوایا تھا۔ ویسے بھی میرا ویزا اسٹوڈنٹ ویزا تھا۔ اس لیے مجھے روحانہ کی باتوں میں سچائی دکھائی دی اور اس سے بڑھ کر یہ کہ ہندوستان جیسے اجنبی ملک میں ایک پاکستانی سے ملاقات ہو جانا غنیمت ہی غنیمت تھا۔ اس لیے میں بھی قدرے بے تکلف انداز میں بولا۔

''اچھا تو آپ میری جاسوسی کر رہی تھیں۔''

وہ فوراً سنبھل کر بولی۔ ''جی نہیں ہرگز نہیں وہ تو استقبالیہ پر موجود لڑکی نے مجھے بتایا تھا۔ میں کمرا نمبر ستائیس میں ٹھہری ہوئی ہوں۔ انڈیا گھومنے کا ارادہ ہے۔ چند رشتے دار بھی ہیں۔ ان سے بھی ملنا ہے۔ آپ بتائیں آپ کیا کرنے آئے ہیں۔''

میں نے اسے بتایا کہ میں بھی انڈیا گھومنے آیا تھا اور اپنے تھیسس کے سلسلے میں چند تاریخی مقامات کی سیر کرنا چاہتا تھا۔ یہ سننا تھا کہ وہ صوفے پر بڑی بے تکلفی سے بیٹھ گئی اور کہنے لگی۔ ''اچھا تو آپ تھیسس لکھ رہے ہیں۔ واہ کیا بات ہے۔ اتنی کم عمر میں اتنا بڑا کام۔ میں واقعی آپ سے متاثر ہوگئی۔''

میں جواباً سر کھجانے لگا۔ کیا کہتا جھوٹ پر جھوٹ بولے جا رہا تھا۔ ایک بار تو جی چاہا کہ اسے انڈیا آنے کا مقصد بتا دوں۔ شاید وہ مدد کر سکے مگر پھر سوچا کہ بہتر ہے کہ اکیلا ہی اپنی مہم سر کروں ایسا نہ ہو کہ اس لڑکی کی وجہ سے کسی مصیبت میں گرفتار ہو جاؤں مگر روحانہ بے

تکلف ہوتے جا رہی تھی اور میں نہ چاہتے ہوئے بھی چاہ رہا تھا کہ وہ میرے ساتھ کمرے میں بیٹھ کر باتیں کرتی رہے۔ نجانے کیوں اس کی باتوں سے معصومیت اور خلوص جھلک رہا تھا۔ کافی دیر گپ شپ کے بعد وہ اچانک اٹھ کھڑی ہوئی اور بولی۔ ''اوہ مجھے تو بہت دیر ہو گئی، آپ بھی بور ہو رہے ہوں گے۔ آئی ایم سوری باتوں میں وقت کا پتا بھی نہ چلا۔ او کے گڈ نائٹ۔'' اتنا کہہ کر وہ کچھ سے بغیر مسکراتی ہوئی نکل گئی۔

میں بھی حیران تھا کہ عجیب طرز کی لڑکی ہے مگر تھی وہ بہت خوبصورت۔ اس کے جانے کے بعد لگا جیسے کمرا بے جان ہو گیا ہو۔ میں اس کے خیالوں میں مگن اپنے بیڈ پر دراز ہو گیا۔ مجھے سخت تھکاوٹ کا احساس ہو رہا تھا۔ مگر نیند شاید آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ روحانہ کا خوبصورت چہرہ اور دلکش سراپا میری آنکھوں میں جیسے بس گیا تھا۔ میں سخت کوفت کا شکار تھا اور اپنے آپ کو کوس رہا تھا کہ روحانہ کو یوں کیوں جانے دیا۔ اسے کچھ دیر روک کر کچھ اور باتیں کر لیتا اچانک اندر سے ایک آواز آئی۔ ''وجاہت خود پر قابو رکھو ابھی تمہاری منزل بہت دور ہے۔'' اور میں اچانک ہڑبڑا گیا۔ پھر میں نے روحانہ کا خیال جھٹکا اور فقیر بابا کی دی ہوئی تسبیح ہاتھوں میں لے کر ذکر کرنے لگا۔ دھیرے دھیرے میری آنکھ لگ گئی۔

☆======☆======☆

رات کا شاید پچھلا پہر تھا میری آنکھ دروازے پر ہلکی سی دستک سے کھل گئی۔ میں حیران تھا کہ اس وقت کون آ سکتا ہے۔ خیر بہت ناگوار موڈ میں دروازہ کھولا تو مزید حیران ہو گیا۔ سامنے روحانہ کھڑی تھی۔ اس نے سفید رنگ کی ریشمی نائٹی پہن رکھی تھی جس سے اس کا جسم جھلک رہا تھا۔ دروازہ کھلتے ہی وہ اچانک اندر آ گئی اور فوراً دروازہ بند کر دیا۔ وہ خاصی گھبرائی ہوئی لگ رہی تھی۔ میں حیران و پریشان اسے دیکھ رہا تھا۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیوں یوں رات گئے میرے کمرے میں گھس آئی تھی مجھے اسے یوں دیکھ کر ڈر بھی لگا مگر مرد ذات ہوں نا اس لیے ظاہر ہی نہ کیا کہ میں ڈر گیا تھا پھر میں نے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''روحانہ خیریت؟'' وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے بولی۔

''خیریت نہیں ہے وجاہت! پتا نہیں کیوں جب سے تم سے مل کر گئی ہوں نیند ہی نہیں آ رہی اور آخر میں بے بس ہو کر تمہارے پاس آ گئی۔ دیکھو ہم دونوں ایک زمین کے

باشندے ہیں یہاں اس اجنبی ملک میں اکیلے اور علیحدہ علیحدہ رات گزار رہے ہیں کیوں نہ ہم رات ساتھ گزار لیں۔'' وہ یہ کہتی جا رہی تھی اور اس کی آنکھوں کا سحر مجھے مسحور کیے جا رہا تھا۔ وہ میرے بہت قریب آتی جا رہی تھی اور میں اس کے طلسم میں جکڑا جا رہا تھا۔ پھر اس نے مجھے میرے بیڈ پر دھکیل دیا اور مسکراتے ہوئے میرے قریب آنے لگی۔ اس وقت وہ اتنی حسین اور سحر انگیز دکھائی دے رہی تھی کہ میں مدہوش ہوا جا رہا تھا اس نے اپنا ہاتھ میری گردن میں ڈالا اور پھر اچانک وہ ایسے چیخی کہ جیسے اسے ایک ہزار والٹ کا کرنٹ لگا ہو۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ سمجھتا وہ بیڈ سے نیچے گر پڑی۔

اچانک میری نظر فقیر کی دی ہوئی تسبیح پر پڑی جو روحانہ کے ہاتھ میں تھی۔ شاید میری گردن میں ہاتھ ڈالتے ہوئے اس کے ہاتھ میں فقیر بابا کی دی ہوئی تسبیح آ گئی تھی جو میرے تکیے کے نیچے رکھی ہوئی تھی مگر اگلا لمحہ میرے لیے انتہائی رقت آمیز تھا۔ روحانہ اپنے دوسرے ہاتھ سے تسبیح کو اپنے ہاتھ سے ہٹانے کی کوشش کر رہی تھی مگر لگتا تھا کہ تسبیح جیسے اس کے ہاتھ سے چپک گئی ہو پھر اچانک روحانہ کے اس ہاتھ کی جلد جلنے لگی جس میں تسبیح چپکی ہوئی تھی اور وہ بری طرح چیخنے لگی۔ اس سے پہلے کہ میں اس کی مدد کرتا اس کے پورے وجود میں آگ بھڑک اٹھی اور وہ کسی ذبح کیے ہوئے جانور کی طرح چنگھاڑنے لگی پھر میں نے ایسا منظر دیکھا کہ میرا دل دہل گیا۔ آگ کے شعلوں میں جلتی ہوئی روحانہ کی شکل بدلنے لگی تھی۔ چند لمحوں میں اس خوبصورت روحانہ کی شکل ایک بھیانک چڑیل نما عورت جیسی ہو گئی۔ وہ جل رہی تھی، چیختے ہوئے بولی۔ ''بچ گیا مگر یاد رکھ ہم تمہیں تمہاری منزل تک نہیں پہنچنے دیں گے۔''

اور پھر آگ کے شعلوں نے اسے پوری طرح گھیر لیا چند لمحوں میں وہ راکھ ہو گئی اور پھر دھیرے دھیرے وہ راکھ غائب ہوتی چلی گئی۔ صرف تسبیح بالکل سلامت فرش پر پڑی ہوئی تھی۔ میں خوف اور دہشت کے مارے ساکت کھڑا تھا۔ پھر ہمت کر کے میں نے تسبیح کی طرف ہاتھ بڑھایا تو اچانک فقیر بابا کی آواز تسبیح کے دانوں میں سے گونجی۔

''حق ہو اللہ، راہ حق پہ چلنے والے نفس کے تابع نہیں ہوتے۔ اگر تیرے بزرگوں کی دعائیں تیرے ساتھ نہ ہوتیں تو آج تُو گمراہ ہو چلا تھا۔ اب سنبھل جا اور اپنا کام کر۔ حق ہو اللہ ہو۔'' اور پھر کمرے میں سکوت طاری ہو گیا۔ میں سخت نادم ہو گیا۔ واقعی میں کچھ دیر کے

لیے شیطانی بہکاوے میں آ چکا تھا۔ فقیر بابا کی تسبیح میرے سرہانے نہ ہوتی تو شاید میں واقعی بہک جاتا اور تباہ و برباد ہو جاتا۔ میں نے فوراً وضو کیا، تہجد کی نماز پڑھی اور گڑگڑا کر اللہ کے حضور اپنی کوتاہی کی معافی مانگنے لگا۔ گڑگڑاتے گڑگڑاتے میری آنکھ لگ گئی اور میں نے اپنے آپ کو حضرت نظام الدین اولیاؒ کے حضور پایا وہ مجھ سے کہہ رہے تھے۔ ''وجاہت میاں! شیطانی راستوں میں عیش و عشرت اور آسانیاں ہیں مگر فقیروں کے طرز میں سختیاں اور پریشانیاں ہیں۔ شیطان اور فقر کے درمیان تمیز صرف نفس کا تزکیہ ہے۔ اس لیے سنبھل کر چلو اور اپنے بزرگوں کی روش اختیار کرو۔ انشاء اللہ کامیابی تمہارے قدم چومے گی۔''

میری آنکھ کھلی تو فجر کا سماں تھا۔ میں نے نماز فجر ادا کی اور صبح آٹھ بجے کا الارم لگا کر سو گیا۔ اس وقت میرے عزائم انتہا کو پہنچے ہوئے تھے دل پاکیزگی اور نور سے کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ اس لیے میں نے فیصلہ کر لیا کہ اب کوئی بھی نفسانی روش نہیں اختیار کروں گا اور صبح اٹھتے ہی تاراپور کا سفر اختیار کروں گا۔

☆======☆======☆

عین اس وقت تاراپور سے چھبیس کلومیٹر دور رتنی پہاڑی کی چوٹی پر بنے ہوئے کالی ماں کے مندر میں کالی ماں کے پجاری راگو شیام نے چھ ماہ کے انسانی شیر خوار بچے کے خون کا بھرا پیالہ منہ سے لگا کر غٹا غٹ پی لیا اور دھاڑا۔ ''کالی ماں! شکتی (طاقت) دے۔ اپنے اس پجاری کو۔ وہ کم ذات تیرے پجاریوں کو تباہ کرنے آ رہا ہے۔ آج رات بھی اس نے تیری چہیتی پجارن ویشنا کو جلا دیا۔ اب تُو شکتی دے اپنے پجاری کو کہ وہ ہمیں مارنے سے پہلے خود مر جائے۔ میں اس کا خون تیرے چرنوں میں چھڑکوں گا اور تُو شانت ہو جا اے کالی ماں! تُو شکتی دے۔''

پھر راگو نے ہاتھ کا اشارہ کیا اور دو پجاری جو کونے میں سہمے کھڑے تھے رسیوں میں جکڑا ہوا ایک دوسالہ بڑبچہ آگے لے آئے۔ راگو پھر دھاڑا۔ ''دیکھ کالی ماں! آج تیرے چرنوں میں، میں ایک مسلمان بچے کا خون ڈال رہا ہوں تو اسے قبول کر۔'' اور پھر اس کے دائیں ہاتھ میں ایک تیز دھار خنجر نمودار ہوا۔ دو سالہ منصور اپنے انجام سے بے خبر سہما کھڑا تھا۔ اچانک اس کی گردن راگو کے خنجر سے کٹ گئی۔ وہ بیچارہ چیخ بھی نہ پایا۔ راگو نے معصوم بچے کا گرم گرم خون پیالے میں بھرا اور کالی ماں کے چرنوں میں ڈال دیا۔ مندر میں قہقہے

گونجنے لگے۔کالی ماں نے راگو کی قربانی قبول کر لی تھی۔راگو دھاڑتا رہا۔'' کالی ماں،کالی ماں شکتی دے۔'' باقی پجاری سہمے کھڑے یہ خونی منظر دیکھ رہے تھے۔

☆======☆======☆

کوسوں دور وجاہت علی اپنی تسبیح پر۔''یا حی یا قیوم'' کا ورد کرتے کرتے سو گیا تھا۔

صبح آٹھ بجے میری آنکھ کھلی۔پچھلی رات کے واقعات میرے ذہن میں تازہ تھے۔ خوف کی ایک سرد لہر ایک بار پھر میرے جسم میں دوڑی مگر اگلے لمحے میں پُرسکون ہو گیا اور دل کی گہرائیوں سے اللہ تبارک وتعالیٰ کا شکر ادا کیا۔جس نے مجھے شیطان کے پجاریوں سے محفوظ رکھا۔ناشتہ کر کے میں نے ہوٹل کا بل ادا کیا اور قریبی ٹیکسی اسٹینڈ پر پہنچ گیا۔ میں نے ایک ایسی ٹیکسی کا انتخاب کیا۔جس کا ڈرائیور سکھ تھا۔اپنی ٹیکسی کی جانب مجھے آتا دیکھ کر وہ چہکا۔

''آؤ آؤ سرکار،کدھر جانا ہے۔''

میں نے اسے غور سے دیکھا۔اس کے چہرے سے بے وقوفی ٹپک رہی تھی۔ میں نے مطمئن ہو کر جواب دیا۔''منگھیر اسٹیٹ تک جانا ہے،کیا لو گے؟''

جواباً اس نے اپنے پیلے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے جواب دیا۔''سرکار تسی تے مسلمان لگتے ہو،جو دل کرے دے دینا۔''

میں نے بھی زیادہ بحث میں اُلجھنا مناسب نہ سمجھا۔ڈگی میں اپنا بیگ رکھوا کر اس کے ساتھ اگلی سیٹ پر ہی براجمان ہو گیا۔مجھے علم نہیں تھا کہ منگھیر کا اس شہر سے فاصلہ کتنی دیر کا ہو گا مگر اس ڈرائیور کو یہ احساس ہونے نہیں دینا چاہتا تھا کہ میں پہلی بار منگھیر جا رہا ہوں۔ کہیں وہ کوئی مشکل نہ پیدا کر دے میری مشکل سردار جی نے خود ہی حل کر دی۔گاڑی چلتے ہی اس نے بولنا شروع کر دیا۔

''سر جی! ادھر تو پہنچتے پہنچتے شام ہو جائے گی۔منگھیر دور تو نہیں پر راستہ صاحب جی بڑا خراب ہے۔پھر آج کل ذرا ڈاکو شاکو بھی تنگ کرتے ہیں پر تسی فکر نہ کرو جی۔میرے ہوتے ہوئے کچھ بھی نہیں ہوگا۔او جی گرو دی قسم،تسی تے آنچ بھی نہیں آنے دوں گا۔تسی جی بالکل بے فکر ہو کر سفر کرو۔''

اس کی باتیں سن کر میں خاک بے فکر ہوتا اس کی باتوں کا صاف مطلب تھا کہ راستہ

پیچیدہ اور انتہائی خطرناک تھا۔چوں کہ میرے پاس تقریباً دو ہزار امریکن ڈالر بھی تھے اس لیے ڈاکوؤں کا سن کر میں اور بھی پریشان ہو گیا۔میں نے تہیہ کر لیا کہ کسی بھی قریبی ہوٹل میں رقم اپنے جوتوں کے اندر چھپالوں گا۔اس لیے میں کسی بھی ایسے ہوٹل کے آنے کا انتظار کرنے لگا۔میری خوش قسمتی کہ کچھ فاصلے پر ہی ایک چھوٹا سا روڈ ریسٹورنٹ مل گیا میں نے ٹیکسی رکوائی اور سگریٹ خریدنے کے بہانے ریسٹورنٹ میں گھس گیا۔سگریٹ کی ایک ڈبیہ خریدنے کے بعد میں نے ایک کپ چائے کا آرڈر دیا اور ریسٹورنٹ کے واش روم میں گھس گیا۔رقم میں نے اپنے پرس میں سے نکال کر دونوں پاؤں کی جرابوں اور جوتوں کے اندر محفوظ کر لی اور تھوڑی سی رقم جو انڈین کرنسی کی صورت میں تھی پرس کے اندر ہی رہنے دی۔ واش روم سے نکل کر میں ہوٹل کے ہال میں بیٹھ گیا۔صبح کا وقت تھا اس لیے ہال خالی تھا۔ ریسپشن پہ ایک سانولی،خوش شکل ہندو لڑکی بیٹھی مجھے گھور رہی تھی مگر میں نے اسے دیکھتے ہی پچھلی رات کی رومانٹک ٹریجڈی کو یاد کیا اور ایک جھرجھری لیتے ہوئے دوسری طرف منہ پھیر لیا۔اتنے میں ایک غلیظ بنیان اور دھوتی پہنے ویٹر چائے لے آیا۔میں نے چائے کے دو تین گھونٹ اپنے گلے میں انڈیلے،بل ادا کیا اور کاؤنٹر پر کھڑی لڑکی کو نظر انداز کرتا ہوا ٹیکسی میں آبیٹھا۔سردار جی نے فوراً گاڑی اسٹارٹ کی اور ایک بار پھر ہمارا سفر شروع ہو گیا۔اس مرتبہ پھر سردار جی نے بولنا شروع کر دیا۔

''جی،سر جی! کیسی لگی یہاں کی چائے۔''

''ہاں ٹھیک تھی۔''میں نے قدرے توقف سے جواب دیا۔

''ہاں سر جی! یہاں کی چائے اور کھانا کچھ خاص نہیں۔ویسے اگر آپ کہیں تو دوپہر کے کھانے پر میں آپ کو ایسے ہوٹل پر لے جاؤں گا جو ہمارے ایک سردار صاحب کا ہے۔پر صاحب جی! کیا کھانا ہے،کیا زبردست چائے ہے وہاں اور جی وہاں پر جو چھوکری ہے وہ جی اپنی سکھنی ہے۔پر جی کیا چیز ہے۔آپ ایک دم خوش ہو جاؤ گے اور تو اور اگر تسی کوئی دیسی یا ولایتی شراب چاہو تو وہ بھی مل جاوے گی۔''

میں نے قدرے چڑتے ہوئے کہا۔''ہاں ہاں ٹھیک ہے۔کھانے کی حد تک تو ٹھیک ہے۔ہم وہیں رک کر کھانا کھا لیں گے۔''

اس نے تشکر آمیز نگاہوں سے مجھے دیکھا اور ایک بار پھر اپنے پیلے دانتوں کی نمائش

کر دی میں نے اس کی باتوں کو نظر انداز کرنے کے لیے گاڑی میں لگا ٹیپ ریکارڈر آن کر دیا۔ مگر یہ شاید ایک بہت بڑی غلطی تھی۔ ادھر ٹیپ آن ہوا اور ایک پنجابی گانے کی آواز آئی۔ ادھر سردار جی نے اسٹیئرنگ چھوڑ کر بھنگڑا ڈالنے کے انداز میں ہاتھ گھمانا شروع کر دیے۔ سونے پہ سہاگہ یہ کہ جتنی تیز آواز میں گانا بج رہا تھا، اس سے دگنی آواز میں سردار جی خود گانا گانے لگے۔ میں اپنی حماقت اور سردار جی کی زندہ دلی پر تلملا کر رہ گیا اور فوراً ہی ٹیپ بند کر دیا۔ ٹیپ بند ہوتے ہی سردار جی کا منہ بھی بند ہو گیا اور بھنگڑے کے لیے اٹھے ہوئے ہاتھ اسٹیئرنگ پر آ گئے۔ میں نے سکون کا سانس لیا مگر ابھی یہ سکون کا سانس شاید آدھا اندر اور آدھا باہر تھا کہ سردار جی پھر گویا ہوا۔

''صاحب جی! واہ جی کیا بات ہے اپنی پنجابی موسیقی کی اور کیا بات ہے، اپنے بھنگڑے کی اور کیا بات ہے جی اپنے پنجاب کی.....''

میں نے ''ہاں بالکل بالکل'' کہہ کر اس کی بات کاٹ دی۔ مجھے اگرچہ اس کے ساتھ سفر کرتے ہوئے الجھن ہو رہی تھی مگر ایک سکون تھا کہ اس نے مجھ سے ابھی تک نہیں پوچھا کہ میں کہاں سے آ رہا ہوں اور منگھیر کیوں جا رہا ہوں اگر میرا حلیہ مسلمانوں جیسا نہ ہوتا تو شاید وہ یہ بھی نہ پوچھتا۔ اس لیے میں نے اس کی بک بک کو نظر انداز کرتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''سردار جی! یہ تو بتاؤ کہ منگھیر کے قریب تاراپور کبھی گئے ہو؟''

سردار جی فوراً چہک کر بولے۔ ''ہاں صاحب جی! دو تین مرتبہ گیا ہوں مگر صاحب جی وہ گاؤں کم اور کھنڈر زیادہ ہے۔ ادھر تو جی شام سے پہلے ہی لوگ گھروں میں دبک جاتے ہیں۔ بہت سارے لوگ تو تاراپور چھوڑ کر کہیں اور آباد ہو گئے ہیں۔ صرف وہی لوگ وہاں آباد ہیں جو اپنی کاشت شدہ زمینوں کو چھوڑنا نہیں چاہتے یا جو جرائم پیشہ ہیں۔ کیوں کہ وہاں پر پولیس وغیرہ کا کوئی گزر نہیں۔ وہاں پر بسنے والے زیادہ لوگ تو بڑی بڑی رقمیں لے کر ساتھ کے گاؤں، دیہاتوں میں جا کر مسلمانوں کا خون خرابہ کرتے ہیں اور پھر واپس آ کر وہیں پناہ ڈھونڈتے ہیں۔ ویسے جی! میں بھی اب سوچ رہا ہوں کہ آخر تسی ادھر کیوں جا رہے ہو۔ ادھر تو مسلمان کو دیکھتے ہی ترشول سے ذبح کر دیتے ہیں۔ وہ بڑے حرامی لوگ ہیں۔ تسی نہ ہی جاؤ تو اچھا ہوگا۔ وہ تسی نال میرا بھی بڑا مذاق اڑائیں

میں سردار جی کی باتیں سن کر پریشان ہو گیا مگر میں فیصلہ کر چکا تھا کہ ہر حال میں اپنی آبائی حویلی جاؤں۔ لہٰذا میں نے یہ پلان بنایا کہ تاراپور سے ایک آدھ میل دور اتر کر سردار جی کو فارغ کر دوں گا اور حلیہ بدل کر رات کی تاریکی میں تاراپور میں واقع اپنی حویلی میں گھس جاؤں گا۔ یہ بات میں سردار جی کو نہیں بتانا چاہ رہا تھا مگر اسے تسلی دینے کے لیے میں نے کہا۔

''سردار جی! آپ پریشان مت ہوں۔ میں تاراپور سے پہلے ہی اتر جاؤں گا۔ ہمیں تاراپور تو نہیں جانا۔''

سردار جی نے ہاتھ جوڑ کر نمستے کرتے ہوئے کہا۔ ''شکر ہے گرو کا۔'' اور پھر گاڑی کی طرف متوجہ ہو گیا۔

شہری آبادی سے نکل کر اب ہم ویران جنگل کے بیچ واقع ایک انتہائی ٹوٹی پھوٹی سڑک پر سے گزر رہے تھے۔ گاڑی کی اسپیڈ بہت کم تھی۔ سردار جی ایک پاپ گانے کی دھن گا رہے تھے۔ یہ پُر پیچ سفر بغیر کسی حادثے کے ایک روڈ ریسٹورنٹ پر ختم ہوا۔ یہ اسی سردار جی کا ہوٹل تھا۔ جس کا ذکر ٹیکسی ڈرائیور نے کیا تھا۔

دوپہر کے تقریباً ڈھائی بج رہے تھے۔ بھوک سے میری حالت غیر ہوئے جا رہی تھی۔ سردار جی کے ہوٹل پر رکنا تھا کہ ٹیکسی ڈرائیور سردار جی نے بھنگڑا ڈال کر اودھم مچانا شروع کر دیا۔ اسے دیکھ کر ہوٹل کے کاؤنٹر پر کھڑے ایک اور سردار جی نے بھی بھنگڑا ڈال دیا۔ یہ شاید اسی ہوٹل کے مالک تھے۔ جب دونوں سردار صاحبان ناچ کود سے ہلکان ہو گئے تو اچانک ٹیکسی والے سردار جی کو میرا خیال آیا۔ اس نے ہوٹل کے مالک سے میرا تعارف کرایا۔

''پا جی! اے مُسلا اے۔ پاکستان تو آیا وے۔ پر جی بڑا چنگا منڈا اوے۔'' (بھائی جان یہ مسلمان ہے پاکستان سے آیا ہے مگر ہے بڑا اچھا لڑکا) سردار جی نے یہ سن کر مجھے گلے لگایا اور بڑی بلے بلے کی۔ پھر اس نے کھانا لگوایا۔ واقعی اتنا اچھا کھانا میں نے ہندوستان میں داخل ہونے کے بعد اب تک نہ کھایا تھا۔

کھانے کے دوران دونوں سردار صاحبان کی گفتگو سے مجھے ان کے ناموں کا پتا چلا۔ ٹیکسی ڈرائیور کا نام دھرم سنگھ تھا جب کہ ہوٹل کے مالک کا نام کرتار تھا۔ دونوں بے حد

بے تکلف ہو کر گفتگو کر رہے تھے۔ جسے سن کر مجھے شرمندگی ہو رہی تھی۔ اچانک کرتار سنگھ نے دھرم سے پوچھا۔

''یار توں اس منڈے نوں تاراپور کیوں لے جا ریاں وے؟'' (تم اس لڑکے کو تاراپور کیوں لے جا رہے ہو)

دھرم سنگھ کیا جواب دیتا۔ پریشانی سے میری طرف اشارہ کر کے بولے۔ ''تسی پوچھ لو۔'' (آپ ہی پوچھ لیں)

کرتار نے مجھے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''ہاں جواناں، سمجھ نہیں آتی۔ دشمن ملک سے آئے ہو اور وہاں جا رہے ہو جہاں پاکستانی ہونا دور کی بات اگر تمہارے مسلمان ہونے کا بھی کسی کو شبہ ہو گیا تو کاٹ دیے جاؤ گے۔ پھر تمہارا ادھر جانا کچھ سمجھ نہیں آ رہا پتر۔''

میں جو اتنی دیر سے ایسے کسی سوال کو نظر انداز کرنا چاہ رہا تھا۔ کرتار سنگھ کے اس طرح پوچھنے پر چونک گیا۔ سمجھ نہ آیا کہ کیا جواب دوں اور جواب دیتا بھی تو کیا، کہتا کہ وہاں اپنے آباؤ اجداد کی امانتیں لینے جا رہا ہوں ایسا کہنا بہت غیر مناسب ہوتا۔ میں کسی پر بھی اعتبار نہیں کر سکتا تھا۔ پہلے بھی ٹرین کے سفر کے دوران میں نے اس بوڑھے شیطان پر اعتماد کر کے بہت پریشانی اٹھائی تھی اور اب جب کہ میں تاراپور سے چند گھنٹوں کی دوری پر تھا۔ میں کسی قسم کا رسک نہیں لینا چاہ رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ کرتار سنگھ میرے بارے میں کسی قسم کے شک میں مبتلا ہوتا، میں نے فوراً جھجکتے ہوئے جواب دیا۔

''سردار جی! آپ سے کیا چھپانا۔ میں دراصل ہندو مسلم فسادات اور ان کے باہمی جھگڑوں پر ایک تحقیقاتی مقالہ لکھ رہا ہوں۔ اس لیے ہمت کر کے ان علاقوں میں جا رہا ہوں جہاں ہندو مسلم فسادات ہوئے۔''

یہ سن کر سردار جی کا ماتھا ٹھنکا۔ شاید وہ میرے جواب سے مطمئن نہیں ہوا تھا اس لیے پھر بولا۔ ''تو پھر پتر گجرات جاؤ، دکن جاؤ، ادھر کیا کرنے آ گئے ان ویرانوں میں؟''

میں کیا جواب دیتا۔ یہ سکھڑا تو دوسرے سکھوں سے بہت مختلف تھا۔ بڑا شکی اور ذہین لگتا تھا اس لیے میں نے مسکراتے ہوئے ''جی...... جی'' اور باتھ روم کا بہانہ کر کے اٹھ کھڑا ہوا۔ باتھ روم میں، میں نے منہ ہاتھ دھویا اور اپنے حواس بحال کرنے لگا۔ میں اب فوراً

یہاں سے نکلنا چاہتا تھا۔ مگر اس اجنبی علاقے میں کہاں بھٹکتا۔ دھرم اور کرتار پہلے ہی میرے بارے میں مشکوک ہو گئے تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ مجھے پولیس کے حوالے کرتے، میں نے مناسب سمجھا کہ کرتار سنگھ کو جو کافی ذہین اور معاملہ فہم لگ رہا تھا۔ اپنے آنے کا مقصد صاف صاف بتا دوں۔ میں نے ایسا کرنے کا مصمم فیصلہ کیا اور باتھ روم سے باہر نکل آیا۔ کرتار اور دھرم آپس میں کچھ سرگوشیاں کر رہے تھے۔ ان کی نظریں باتھ روم کی جانب تھیں۔ میں سمجھ گیا کہ وہ دونوں میرے بارے میں کچھ زیادہ ہی مشکوک ہو گئے تھے اس لیے میں بڑے اطمینان سے ان کے پاس پہنچا۔ دونوں نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔ پھر کرتار نے پوچھ ہی لیا۔

''جواناں، مجھے لگتا ہے کہ بات کچھ اور ہے تُو کسی اور چکر میں ہے، سچ بتا دے تو تیرا بھلا ہی ہو گا۔ ہم سردار ہیں زبان کے پکے اور دل کے کھلے۔ چل پتر بتا دے کیا بات ہے جو تُو چھپا رہا ہے۔''

میں نے ایک لمبی سانس بھری اور انہیں تاراپور جانے کی اصل کہانی سنا دی۔ بطور ثبوت میں نے انہیں اپنے مرحوم والد کا خط بھی دکھا دیا جو ان کے پلے نہ پڑا کیوں کہ خط اردو میں تھا۔ میری کہانی سن کر وہ دونوں بڑی مہربان نظروں سے مجھے دیکھنے لگے۔ پھر کرتار گویا ہوا۔

''وجاہت پتر، تُو ایک اچھے مقصد کے لیے آیا ہے اس لیے میں تیری مدد ضرور کروں گا۔ تُو نے واقعی اچھا کیا جو ہمیں اپنے تاراپور جانے کا مقصد بتا دیا ورنہ تو وہاں جا کر بڑی مصیبت میں گرفتار ہو جاتا کیوں کہ وہاں کے رہنے والے بھی تیرے لیے کسی شیطان سے کم نہیں۔ مگر اب جب کہ تُو نے مجھ پر اعتماد کیا ہے تو پتر، کرتار مرتے دم تک تیرا ساتھ دے گا۔'' اتنا کہہ کر وہ زور سے چیخا۔ ''رانی پتر ادھر آ۔''

جواباً ایک نسوانی آواز سنائی دی۔ ''جی پاپا جی! آئی۔''

پھر ہوٹل کے کچن سے ایک جوان گندمی رنگ کی لڑکی نکلی۔ اس نے کالے رنگ کی کسی ہوئی قمیض پہن رکھی تھی۔ جو اس کے جوان بھرے ہوئے جسم کو عیاں کر رہی تھی۔ اس کے ساتھ پیلے رنگ کا لہنگا بہت بھدا لگ رہا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ کہنیوں تک چوڑیوں سے لدے ہوئے تھے۔ وہ ننگے پاؤں کودتی ہوئی ہماری جانب آ رہی تھی۔ قریب آتے ہی اس

نے اپنی بانہیں کرتار سنگھ کی گردن میں ڈال دیں۔ ''جی پاپا جی بولو۔''

میں نے اسے غور سے دیکھا۔ وہ ایک خوب صورت لڑکی تھی مگر اسے یوں دیکھنا مجھے مناسب نہ لگا۔ اس لیے میں نے اپنا منہ دھرم سنگھ کی طرف موڑ لیا جو دیدے پھاڑ کر اس سکھنی کو تکے جا رہا تھا جو شاید کرتار کی بیٹی تھی۔ مجھے اپنی طرف متوجہ پا کر دھرم سنگھ نے مجھے آنکھ ماری اور میں سمجھ گیا کہ رانی وہی لڑکی ہے جس کا دھرم سنگھ نے ٹیکسی میں بڑے زور و شور سے ذکر کیا تھا۔ خیر میں نے دھرم سنگھ کو نظر انداز کیا اور سوچنے لگا کہ کرتار نے اپنی بیٹی کو کس لیے بلایا ہے مگر میری یہ ذہنی کشمکش بھی کرتار سنگھ نے فوراً حل کر دی۔ اس نے اپنی بیٹی سے میرا تعارف کرایا۔ یہ سن کر کہ میں پاکستانی ہوں اور شہر لاہور سے انڈیا آیا ہوں۔ رانی نے آنکھوں ہی آنکھوں میں مسکرا کر میرا والہانہ استقبال کرنے کے اشارے دیے۔ اس کے بعد کرتار سنگھ نے اسے میری کہانی لفظ بہ لفظ بیان کر دی۔ جسے سن کر رانی کی مسکراہٹیں غائب ہو گئیں اور وہ قدرے پریشان ہو کر پہلی مرتبہ مجھ سے مخاطب ہوئی۔

''بابو جی! آپ تو واقعی بڑی خطرناک جگہ جا رہے ہو۔ تاراپور کی کھنڈر حویلی تو جی بڑی خطرناک جگہ ہے۔ میری ایک سہیلی وہیں تاراپور میں رہتی ہے۔ اس کے منہ سے سنا تھا کہ وہ حویلی اب تاریک کھنڈر بن چکی ہے۔ دن کی روشنی میں بھی کھنڈرات دور سے اتنے تاریک اور بھیانک نظر آتے ہیں کہ بڑے بڑے سورما ان کے قریب نہیں پھٹکتے۔ اسی نے بتایا تھا کہ ایک دن اس کے گاؤں کی ایک گائے کھنڈرات کے اندر گھس گئی۔ گائے کے پیچھے اس کا رکھوالا بھی بھاگا مگر شام تک دونوں باہر نہ نکلے۔ گاؤں والوں کو پریشانی ہوئی تو سب مل کر بھالے اٹھائے کھنڈرات کی جانب دوڑے۔ مگر کھنڈرات کے قریب پہنچتے ہی ان کی چیخیں نکل گئیں کیوں کہ کھنڈرات کے ٹوٹے ہوئے دو میناروں پر گائے اور رکھوالے کے کٹے ہوئے سر موجود تھے۔ پھر اچانک گائے کے کٹے ہوئے سر نے چلانا شروع کر دیا۔ ساتھ ہی رکھوالے کے کٹے ہوئی سر سے دردناک چیخوں کی آوازیں آنے لگیں۔ یہ خونی منظر دیکھ کر گاؤں والے وہاں سے سرپٹ بھاگے۔ اس کے بعد کوئی بھولے سے بھی کھنڈرات کا رخ نہیں کرتا۔ میری سہیلی کا کہنا ہے کہ ان کھنڈرات پر شیطانی روحوں کا قبضہ ہے۔ پھر تسی صاحب جی اُدھر جا کر بہت خطرہ دیکھو گے۔''

اس کی باتیں سن کر میں نے جواب دیا۔ ''دیکھو رانی! میں وہاں ایک نیک مقصد کے

لیے جا رہا ہوں اور اگر میں ان سب چیزوں سے ڈر گیا جو تم نے ابھی بیان کی ہیں تو شاید یہ شیطانی روحیں میری نسلوں تک کو تباہ کر دیں۔ ویسے بھی مجھ پہ میرے بزرگوں کا ہاتھ ہے اس لیے یہ شیطانی چیزیں میرا بال تک بیکا نہیں کر سکتیں۔''

رانی میری حوصلہ مند باتوں سے متاثر ہو گئی۔ کرتار بھی تحسین آمیز نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگا جب کہ دھرم سنگھ اب بھی ارد گرد سے بے خبر رانی کے سراپے کو تاڑ رہا تھا۔ اچانک رانی کچن کی طرف بھاگی اور چند لمحوں میں گرم گرم چائے لے آئی۔ کچھ دیر کی رسمی گفتگو کے بعد کرتار سنگھ نے رانی سے کہا۔

''پتر رانی تاراپور اس اجنبی مُسلے کے لیے اتنا ہی خطرناک ہے جتنا کہ وہاں کے ویران کھنڈر، کیوں کہ گجرات کے مسلم کش فسادات کے بعد ملک بھر میں حالات مسلمانوں کے خلاف ہیں۔ تاراپور میں اگر کسی کو وجاہت صاحب کی اصلیت کا پتا چل گیا تو کھنڈرات تک پہنچنے سے پہلے ہی کاٹ دیا جائے گا۔ چوں کہ اب یہ ہمارا مہمان ہے اس لیے اس کی حفاظت اور مدد کرنا ہمارا دھرم ہے۔ میں نے فیصلہ کیا ہے تم اور دھرم سنگھ وجاہت کے ساتھ تاراپور جاؤ گے اور کھنڈرات تک پہنچانے میں اس کی ہر ممکن مدد کرو گے۔ تم سمجھ دار ہو پھر تاراپور میں تمہاری سہیلی بھی ہے تم اس کی مدد بھی لے سکتی ہو مگر یاد رکھو، اس کام میں کسی اور کو شریک مت کرنا۔ ہے تو وہ تمہاری سہیلی مگر اسے جب پتا چلے گا کہ تمہارے ساتھ ایک مُسلا ہے تو وہ تمہاری دوستی کو بھول کر اپنی دشمنی کی بھڑاس اس بے چارے پر نکالے گی اس لیے بڑی احتیاط کرنا۔ میں بھی ساتھ چلتا مگر اس طرح یہاں کاروبار بند کر کے جانا بھی ٹھیک نہیں۔ دھرم سنگھ تمہارے ساتھ ہوگا۔ وہ تمہارا خیال رکھے گا۔''

یہ سن کر رانی منہ بنایا اور بولی۔ ''باقی سب تو ٹھیک ہے مگر یہ دھرم سنگھ چاچا آخر ہمارے ساتھ کیوں جائے گا۔''

یہ سن کر دھرم سنگھ بولا۔ ''اسے رانی تو مینوں چاچا کیوں بولدی ایں۔''

''تو پھر کیا تینوں بھتیجا بولوں۔'' رانی بگڑ کر بولی اور کرتار نے قہقہہ لگایا اور قریب پڑے حقے کے کش لینے لگا۔

☆======☆======☆

ایک گھنٹے بعد میں، رانی اور دھرم سنگھ تاراپور کی جانب رواں تھے۔ کرتار سنگھ ہمیں جلد

واپسی کی دعائیں دے کر وہیں رہ گیا تھا۔ میں حیران ہو رہا تھا کہ آج کے دور میں بھی کرتار سنگھ جیسے اچھے لوگ موجود ہیں، جو دوسروں کی خاطر ہر مشکل میں اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور ساتھ نبھانے میں کسی بھی حد تک چلے جاتے ہیں۔ شاید یہ کرتار سنگھ کی ہندو دھرم سے نفرت کا نتیجہ تھا یا پھر اس کی سکھ ذہنیت کا، جس نے کچھ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور شاید اس بارے میں ابھی سوچنا شروع نہیں کیا تھا۔ بہر حال میرے دل میں دونوں باپ بیٹی کے لیے بہت عزت تھی۔ جو اس کٹھن وقت میں میرا ساتھ دے رہے تھے۔ رانی ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھی جب کہ دھرم اور میں اگلی سیٹوں پر۔ دھرم بڑے اچھے موڈ میں گاڑی چلا رہا تھا اور بار بار بیک مرر سے رانی کو گھور رہا تھا۔ جس پر وہ برا منا رہی تھی، مگر دھرم سنگھ ڈھیٹ تھا کہاں باز آتا۔

پروگرام کے مطابق میں نے سکھوں والا حلیہ بنا لیا تھا۔ قد کاٹھ سے میں ویسے بھی پنجاب کا گبھرو ہی لگتا تھا اس لیے سکھ والا حلیہ اور ویسی بات چیت میرے لیے زیادہ مشکل نہیں تھی۔ مجھے اور رانی کو، رات تاراپور میں اس کی سہیلی کے گھر پہنچ کر قیام کرنا تھا۔ وہاں اس بہانے سے کچھ دن قیام کرنا تھا کہ میں اور رانی پسند کی شادی کی خاطر گھر سے بھاگ آئے تھے اور ہمیں اس کی سہیلی کے گھر چند دن گزارنے تھے۔ بقول رانی کے اس کی سہیلی کے لیے ایسا کرنا مشکل نہ تھا کیوں کہ اس کا دبو شوہر اس سے بہت ڈرتا تھا اور گھر میں اس کی مرضی چلتی تھی، اس لیے تاراپور میں چند دن قیام کرنا کوئی بڑا مسئلہ نہ تھا۔ اس دوران مجھے کسی بھی رات غائب ہو کر کھنڈرات پہنچنا تھا اور اپنی امانتیں ڈھونڈ کر واپس آنا تھا، جب کہ دھرم سنگھ اپنی گاڑی کے خراب ہو جانے کے بہانے جتنا زیادہ قیام کر سکتا تاراپور ہی میں رہتا اور ایسا ممکن نہ ہونے کی صورت میں واپس کرتار سنگھ کے پاس لوٹ جانا تھا۔ میں نے اتنا زیادہ وقت گزارنے کے لیے دھرم سنگھ کو معقول معاوضے کی پیشگی ادائیگی دو سو ڈالر کی صورت میں کر دی تھی جب کہ کرتار سنگھ کو بھی میں نے اتنی ہی رقم آفر کی تھی جسے لینے سے اس نے صاف انکار کر دیا تھا۔ جس نے مجھے واقعی متاثر کیا تھا۔

تاراپور تک کا چند گھنٹوں کا یہ سفر دھیرے دھیرے گزرتا رہا۔ میں اور رانی اب قدرے بے تکلف ہو کر باتیں کرنے لگے تھے جب کہ دھرم سنگھ تو رانی کے ساتھ تکلف برطرف کر کے باتیں کر رہا تھا۔ رانی کی باتوں سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ بہ ظاہر ایک الھڑ

حسینہ تھی۔ ہوٹل پر باپ کا ہاتھ بٹانے اور ہر طرح کے لوگوں سے ڈیلنگ کر کے وہ اپنی عمر سے بہت بڑی بڑی باتیں کر لیتی تھی۔ اس وجہ سے بڑی بے باک اور بڑی بے تکلف گفتگو کرنے کی عادی تھی۔ ''وجاہت بابو'' کی بجائے اب وہ بات بات پر ''یار یار'' کہنے لگی تھی۔ کئی دفعہ اس نے کسی ہلکی پھلکی بات پر میرے کندھے پر زور سے ہاتھ مارا۔ جس سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ ذرا آزاد خیال بھی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ دھرم سنگھ اسے دیکھ دیکھ کر آپے سے باہر ہو رہا تھا مگر نہ تو اس نے اور نہ اس کے باپ نے اس بداخلاقی کو برا جانا تھا۔ خیر مجھے دلچسپی اپنے مقصد سے تھی۔ رانی کیسی ہی کیوں نہ ہو۔ وہ اس پورے مرحلے میں میری واحد مددگار تھی۔ میں اس پر بھروسہ کر کے ہی ایک انتہائی خطرناک علاقے میں داخل ہو رہا تھا۔ میں نے اللہ کا ذکر زبان پر جاری رکھا اور پُرسکون ہو گیا۔

☆======☆======☆

رات کے آٹھ بج چکے تھے۔ ہماری ٹیکسی ٹوٹی پھوٹی سڑک پر کم رفتار سے چل رہی تھی۔ دھرم سنگھ کے چہرے پر تھکاوٹ کے آثار نمایاں تھے۔ وہ قدرے ہلکی آواز میں دلیر مہندی کے گانے پر منہ چلا رہا تھا۔ رانی پچھلی سیٹ پر پھیل کر لیٹی ہوئی تھی اس کی کالی قمیض کا وسیع و عریض گلا اس کے جسم کی کھلے عام نمائش کر رہا تھا مگر وہ بے خبر سو رہی تھی۔ دھرم سنگھ کبھی کبھی بیک مرر میں سے اسے دیکھنے کی کوشش کرتا مگر اندھیرے کی وجہ سے وہ کچھ زیادہ دیکھنے سے قاصر تھا۔ ایک آدھ دفعہ اس نے اپنی نگاہوں کی تسکین کے لیے گاڑی کے اندر کی لائٹ جلائی تو رانی نے اسے اتنی بڑی گالی دی کہ اس کے بعد وہ دوبارہ اندرونی لائٹ جلانے کی جرأت نہ کر سکا۔

میرے پوچھنے پر دھرم سنگھ نے بتایا کہ مزید پون گھنٹے کے سفر کے بعد ہم تاراپور میں داخل ہوں گے۔ میں پُرسکون ہو گیا اور سوچنے لگا کہ جلد ہی میں اپنی منزل کے قریب پہنچ جاؤں گا۔ یہی سوچتے سوچتے میں نے گاڑی کے باہر جھانکنا شروع کر دیا باہر سڑک کی دونوں جانب گھپ اندھیرا تھا اور گھنے درختوں کا ایک طویل سلسلہ سڑک کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا جب کہ دھند کی وجہ سے سڑک پر پڑنے والی ہیڈ لائٹ کی روشنی بڑا پُراسرار سماں پیدا کر رہی تھی، میں نے دوبارہ باہر جھانکا اور مجھے یوں لگا جیسے باہر تاریکی میں کچھ انسانی چہرے مجھے گھور رہے ہوں۔ میں نے سر جھٹکا اور سامنے سڑک پر نظریں جما دیں۔ مگر نہ

جاہتے ہوئے پھر کھڑکی سے باہر جھانکا اور مجھے یوں لگا جیسے بہت سے مسخ شدہ انسانی چہرے سرخ خونی آنکھوں سے مجھے گھور رہے ہوں۔ میں نے آنکھیں موند لیں اور اسم اعظم کا ورد شروع کر دیا۔ کچھ لمحوں بعد میں نے آنکھیں کھولیں ا رڈرتے ذرتے باہر جھانکا تو سوائے اندھیرے کے کچھ نظر نہ آیا۔ اچانک مجھے رانی کا خیال آیا اور میں نے مڑ کر دیکھا تو وہ ویسے ہی بے خبر سو رہی تھی۔ میری نظر اس کے سراپے پر کچھ دیر ٹھہری گئی۔ میں نے ایک جھرجھری لی اور منہ موڑ لی ایک بار پھر میں نے باہر جھانکا تو وہی مکروہ چہرے مجھے گھورتے نظر آئے۔ میں دھرم سنگھ کی طرف پلٹا تا کہ اسے بتاؤں کہ وہ بھی باہر دیکھے مگر دھرم سنگھ پہلے ہی دوسری جانب کی کھڑکی سے باہر دیکھ کر گاڑی چلا رہا تھا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ وہ اتنی رات گئے سامنے دیکھے بغیر کیسے گاڑی چلا سکتا ہے۔ میں نے اسے پکارا۔

''دھرم سنگھ!'' وہ اچانک میری طرف پلٹا۔ ''اوہ میرے خدا۔'' اچانک میرے منہ سے نکلا۔ وہ دھرم سنگھ نہیں تھا۔ بلکہ خونی لال آنکھوں والا وہی شیطانی مسخ شدہ چہرہ تھا جو مجھے کھڑکی سے باہر گھور رہا تھا۔ میں نے چیخ کر رانی کو اٹھایا۔ رانی نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھولیں مگر وہ چہرہ رانی کا نہ تھا بلکہ وہ ایک مکروہ جلا ہوا چہرہ تھا جس کی دو لال آنکھیں مجھے گھور رہی تھیں۔ میں نے زور کی چیخ ماری اور چلتی گاڑی سے کود گیا۔ یوں سڑک پہ گرنے سے میرے کافی چوٹیں آئیں۔ مگر اس وقت میری جان پر بنی ہوئی تھی۔ میں نے اٹھ کر دائیں بائیں دیکھا۔ چاروں طرف گھپ اندھیرا تھا۔ سامنے صرف ٹیکسی کی ہیڈ لائٹس نظر آ رہی تھی۔ اچانک مجھے ایسا لگا جیسے سڑک کے دونوں جانب بہت سے لوگ کھڑے ہوں اور اپنی خونی نگاہوں سے مجھے گھور رہے ہوں۔ کچھ دیر ٹھہر کر میں نے دوبارہ سڑک کی بائیں جانب دیکھا تو سینکڑوں آنکھیں مجھے گھور رہی تھیں۔ میرے بدن میں ایک کرنٹ سا لگا۔ میں نے بے اختیار سڑک پر دوڑنا شروع کر دیا۔ مجھے اپنے پیچھے سڑک پر ہزاروں لوگوں کے دوڑنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ میں اور زیادہ تیزی سے بھاگنے لگا پھر مجھے اپنی گردن پر بہت گہری سانسوں اور ڈراؤنی غراہٹ کی آواز سنائی دی۔ میرے قدم بھاری ہونے لگے مگر میں نے مڑ کر پیچھے دیکھنے کی ہمت نہیں کی۔ یونہی بھاگتے بھاگتے میں نے اسم اعظم کا ورد کرنا شروع کر دیا اور بھاگتا رہا۔

کچھ ہی دور ایک موڑ پر مجھے ٹیکسی کھڑی دکھائی دی ٹیکسی کے باہر دھرم سنگھ اور رانی

کھڑے تھے اور پاگلوں کی طرح مجھے آوازیں دے رہے تھے۔ میں اسم اعظم کا ورد کرتا ان کے پاس پہنچا تو میں نے دیکھا کہ یہ وہی دونوں تھے مجھے دیکھ کر رانی نے ایک گندی گالی دی اور کہا۔

''کیا مرنے کا ارادہ تھا جو یوں چلتی گاڑی سے کود گئے۔''

دھرم سنگھ نے کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا۔ مگر میں سمجھ گیا کہ شیطانی روحیں صرف مجھے ستا رہی تھیں۔ اس طرح گاڑی سے کودنا میرے لیے خطرناک ہو سکتا تھا اس لیے میں نے طے کر لیا کہ آئندہ اپنے حواس کو قابو میں رکھوں گا۔

میری زبان پر اسم اعظم جاری ہی تھا کہ ہم تارا پور اپہنچ گئے۔ رانی کی سہیلی پدمنی کا گھر جلد ہی آ گیا۔ میں اور رانی اپنا مختصر سا سامان لے کر گاڑی سے اتر گئے۔ جب کہ دھرم سنگھ قریبی لاری اڈے پر گاڑی لے گیا۔

☆======☆======☆

پدمنی کے دروازے پر دستک دینے کے کچھ دیر بعد دروازہ کھلا۔ دروازہ کھولنے والا پدمنی کا شوہر تھا اس نے رانی کو فوراً پہچان لیا اور ہمیں اندر لے گیا۔ پدمنی رانی کو دیکھ کر حیران و پریشان ہو گئی مگر جب رانی نے اسے اپنی من گھڑت کہانی سنائی تو وہ فوراً رام ہو گئی اور اس نے ہم دونوں کے لیے ایک علیحدہ کمرے میں بستر لگوایا اور کھانے کا بندوبست کرنے لگی۔ کھانے سے فارغ ہو کر وہ ہم سے باتیں کرنے لگی۔ اس کا شوہر ایک کونے میں بیٹھا پان چبا رہا تھا۔ باتوں باتوں میں پدمنی نے بتایا کہ اس کا بھائی رام داس بھی برابر کے کمرے میں اس کے پاس چند دنوں سے ٹھہرا ہوا تھا۔ وہ تارا پور کے قریب کالی دیوی کے مندر پر پوجا کرنے آیا تھا۔ یہ سن کر میرا ماتھا ٹھنکا مگر میں خاموش ہی رہا۔ کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد پدمنی مجھے اور رانی کو ہمارے کمرے میں لے آئی اور شب بخیر کہہ کر چلتی بنی۔

رانی بڑی دل کش نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھی مگر میرا ذہن پدمنی کے بھائی رام داس کی طرف تھا۔ وہ اگر کالی دیوی کا پجاری تھا تو یقیناً کالے علم کے دھندے کا بھی ماہر ہو گا۔ اگر اسے میری اصلیت کا پتا چل گیا تو کیا ہو گا اب تک اس سے سامنا نہیں ہوا تھا اور میرا ارادہ بھی یہی تھا کہ جتنا جلد ہو سکے اپنا کام نپٹاؤں اور یہاں سے چلتا بنوں۔ رانی جذباتی ہو رہی تھی مگر میں اسے نظر انداز کر رہا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ سو گئی۔ میں نے سوچا کہ کل

صبح ہوتے ہی کھنڈرات کا پتا لگاؤں گا اور انشاء اللہ اسی رات کھنڈرات میں گھس جاؤں گا۔
فقیر بابا کی دی ہوئی تسبیح میری جیب میں تھی۔ میں نے وہ نکالی اور تسبیح پڑھنے لگا۔
جب پڑھتے پڑھتے بہت دیر ہو گئی تو مجھے برابر والے کمرے سے عجیب و غریب آوازیں سنائی دیں۔ میں کچھ دیر تو سمجھنے کی کوشش کرتا رہا مگر کچھ پلے نہ پڑا۔ میں دھیرے سے اٹھا اور چپکے سے کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ صحن میں واقع کونے والے کمرے میں ہلکی سی روشنی ہو رہی تھی اور وہیں سے دبی دبی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ میں ہمت کر کے اس کمرے کے قریب پہنچ گیا۔ میرا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ اگر کسی کو میری اس حرکت کا علم ہو جاتا تو میرے لیے کس قدر مشکلات پیدا ہو سکتی تھی۔ مگر پتا نہیں کیوں میرے اندر کی آواز مجھے مجبور کر رہی تھی کہ ان آوازوں کا پتا لگاؤں۔ میں دبے قدموں سے کونے والے کمرے کے دروازے پر پہنچ گیا اور دروازے کی درمیانی دراڑ سے اندر جھانکنے لگا اندر پدمنی اور ایک جوگی نما شخص جو شاید اس کا بھائی رام داس تھا۔ کالی دیوی کے مجسمے کے سامنے دوزانو بیٹھے پوجا میں مصروف تھے۔ دیوی کے چرنوں میں کسی جانور کا کچا دل اور کلیجی پڑی ہوئی تھی۔ وہ دونوں بہن بھائی دھیمی آواز میں منتر پڑھتے اور کلیجی کا ایک ایک ٹکڑا اٹھا کر دانتوں سے چبا لیتے۔ کچھ دیر یہ سلسلہ جاری رہا۔ پھر دونوں نے دیوی کے سامنے ماتھا ٹیکا یا اور کچھ بڑبڑانے لگے۔ یہی وہ وقت تھا جس کے لیے شاید میں اٹھ کر یہاں تک آیا تھا۔
رام داس نے پدمنی سے کہا۔ ''دیکھو دیدی! یہ وہی شخص ہے جس کی پیشگی اطلاع مجھے دو دن پہلے کالی دیوی کے مندر میں ملی تھی۔ میرا علم مجھ سے کہہ رہا ہے کہ یہی وہی شخص ہے۔ چلو اسے قتل کر کے اس کا سر کالی دیوی کے مندر لے جاتے ہیں اس طرح ہم امر ہو جائیں گے۔''

پدمنی دھیرے سے بولی۔ ''کیا تمہیں سو فی صد یقین ہے کہ یہ وہی مسلمان نوجوان ہے جس کے آباؤ اجداد نے ہمارے قبیلے کے لوگوں کو ختم کر ڈالا تھا۔''
رام داس بولا۔ ''ہاں پدمنی بالکل، تم اپنی تسلی کی خاطر اس کے سامان کی تلاش لے لو۔ اس کے پاس ایک کراماتی تسبیح ہے جس کو اگر ہم کالی دیوی کے پجاری چھو لیں تو لمحوں میں راکھ بن جائیں۔''
''تو ٹھیک ہے۔ میں ابھی اس کے سامان کی تلاشی لیتی ہوں۔ اگر یہ وہی بدبخت

مسلمان ہے۔ تو اس کا سر میں کاٹ کر اپنے ہاتھوں سے کالی دیوی کے مندر میں سجاؤں گی۔'' پدمنی بولی۔
''ٹھیک ہے۔ جاؤ میں پوجا پوری کر کے تمہارا انتظار کروں گا۔'' رام داس بولا۔
پدمنی اٹھ کھڑی ہوئی۔ میرے اوسان ایک دفعہ پھر خطا ہو گئے۔ میں تو آتے ہی دھر لیا گیا تھا۔ اس سے پہلے کہ پدمنی دروازہ کھول کر باہر نکلتی۔ میں دبے پاؤں تقریباً بھاگتا ہوا اپنے کمرے میں آ گیا۔ رانی بے خبر سو رہی تھی۔ میں نے دروازے کی دراڑ سے باہر جھکا نکا پدمنی دبے پاؤں اسی طرف آ رہی تھی۔ اس کے دائیں ہاتھ میں ایک بڑا سا خنجر تھا۔
فقیر بابا کی دی ہوئی تسبیح میری جیب میں تھی۔ میں نے وہ نکالی اور تسبیح پڑھنے لگا۔
پڑھتے پڑھتے نجانے کب میری آنکھ لگ گئی۔

☆======☆======☆

پدمنی کے گھر کے کونے والے کمرے میں ہلکی ہلکی روشنی ہو رہی تھی جہاں رام داس اور پدمنی ایک کونے میں دوزانو بیٹھے کالی دیوی کی مورتی کی پوجا میں مصروف تھے۔ مورتی کے قدموں میں کسی جاندار کا دل اور کلیجہ رکھا ہوا تھا۔ ساتھ ہی خون سے بھرا ایک پیالہ بھی تھا۔ دونوں آنکھیں بند کیے منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑا رہے تھے۔ پھر دونوں نے آنکھیں کھول کر باری باری کچے دل اور کلیجے کو چبایا اور خون سے بھرے پیالے کو غٹاغٹ پی گئے۔ خون پیتے ہی دونوں کی آنکھوں میں ایک شیطانی چمک آ گئی۔ رام داس جس کا قد بمشکل پانچ فٹ ہوگا اور جس کی گنجی چمکتی کھوپڑی کے بیچ میں گنتی کے چند بالوں کا ایک لمبا گچھا اس کی ننگی پیٹھ کو چھو رہا تھا۔ اس نیم تاریک کمرے میں بے حد پُراسرار لگ رہا تھا۔ بے حد دھیمی آواز میں وہ پدمنی سے گویا ہوا۔
''پدمنی دیکھ دیوی کی مہربانیاں! سات جنموں سے ہمارے کالے دھرم کے بدترین دشمنوں کا آخری سپوت آج ہمارے چنگل میں ہے اور آج رات جب اس مسلمان کا سر میں اپنے ہاتھوں سے کاٹ کر کالی ماں کے چرنوں میں ڈالوں گا تو ہمیشہ کے لیے امر ہو جاؤں گا۔ پدمنی، آج کی رات واقعی بڑی رات ہے۔ دیوی نے آج مجھے اپنے درشن کرائے ہیں۔ مجھے دیوی سے شکتی (طاقت) ملنے والی ہے۔''
پدمنی حیرت سے بولی۔ ''کیا تجھے یقین ہے کہ یہ وہی لڑکا ہے جس نے کل رات ویشنا

کی روح کو جلا ڈالا تھا۔''

رام داس بولا۔ ''ہاں ہاں پدمنی، میرا علم مجھے وشواس (یقین) دلا رہا ہے اور کالی دیوی کے بڑے پجاری راگوشیام نے اپنی دماغی قوت کی لہروں سے مجھے یہ پیغام دیا ہے کہ یہی وہ لڑکا ہے۔ جو اس وقت ایک سکھ کے روپ میں تمہاری سہیلی کے ساتھ یہاں تک آ پہنچا ہے۔''

یہ سن کر پدمنی آواز دباتے ہوئے بولی۔ ''اس کا مطلب ہے۔ رانی بھی اس مسلمان کا ساتھ دے رہی ہے۔''

رام داس نے کہا۔ ''ہاں اور اس کی سزا یہی ہوگی کہ اسے اب ساری زندگی شیام پجاری کے آشرم میں داسی (لونڈی) بن کر رہنا ہوگا۔'' پدمنی بھی رام داس کا حکم سن کر کانپ اٹھی اور اس نے سر جھکا لیا۔ کچھ لمحوں بعد رام داس یہ کہتے ہوئے اٹھا۔ ''پدمنی آج رات ضروری ہے کہ ان دونوں کو پہاڑی پر واقع دیوی کے مندر لے جا کر شیام جی کے سامنے پیش کیا جائے۔ تم ان کا دروازہ باہر سے بند کر دو تا کہ کہیں بھاگ نہ پائیں۔ میں ابھی مندر سے چند پجاریوں کو لاتا ہوں۔ تا کہ انہیں باندھ کر مندر لے جائیں۔ تم ہوشیار رہنا۔''

یہ کہہ کر رام داس تیزی سے باہر نکل گیا۔ پدمنی نے جھٹ سے اس کمرے کا دروازہ باہر سے مقفل کر دیا۔ جس میں وجاہت اور رانی بے خبر سو رہے تھے اور دوبارہ کونے والے کمرے میں آ کر کالی دیوی کی مورتی کے سامنے آنکھیں موند کر پوجا میں محو ہو گئی۔ اسے اس بات کی کوئی فکر نہیں تھی کہ اس کی ایک اچھی سہیلی اس کے شیطانی کھیل کی بھینٹ چڑھ رہی تھی بلکہ یہ خیال اسے شانت (پُرسکون) کر رہا تھا کہ وہ کالی دیوی کی سیوا (خدمت) کر رہی تھی۔

ایک تاریک سایہ جو کافی دیر پہلے اس کے اور رام داس کے درمیان ہونے والی گفتگو کو سن چکا تھا۔ دروازے کے باہر سے اسے اب بھی جھانک رہا تھا۔

☆======☆======☆

رات کا درمیانی پہر تھا۔ پدمنی بدستور کالی دیوی کی پوجا میں مگن تھی۔ رام داس کو گئے کافی دیر ہو چکی تھی اور اس کی واپسی کسی بھی وقت ممکن تھی۔ عین اس وقت پدمنی کے بیڈروم سے ایک سایہ نکلا اس کے ہاتھ میں ایک بڑا سا خنجر تھا۔ وہ دبے پاؤں اس کمرے کے سامنے پہنچ گیا۔ جس میں وجاہت اور رانی اپنے انجام سے بے خبر سو رہے تھے۔ اس نے

ایک بار اس کمرے پر نظر ڈالی۔ جس میں پدمنی کالی دیوی کے سامنے پوجا میں گم تھی۔ مطمئن ہو کر اس نے دھیرے سے مقفل دروازے کو کھولا۔ اندر زیرو واٹ کے بلب کی روشنی میں رانی اور وجاہت بے خبر سوئے ہوئے تھے۔ وہ دبے پاؤں چلتا ہوا وجاہت کے سر پر پہنچ گیا۔

☆======☆======☆

کمرے میں کسی آہٹ سے میری آنکھ کھلی تو مجھے ایک تاریک سایہ اپنے سر پر کھڑا نظر آیا۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ سامنے پدمنی کا شوہر شنکر سہما سا کھڑا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں خنجر بھی نمایاں تھا۔ پہلے تو میں ڈر گیا کہ شنکر مجھے قتل کے ارادے سے آیا ہے مگر جس طرح وہ سہما سا کھڑا تھا اس سے لگ رہا تھا کہ وہ کسی برے ارادے سے نہیں آیا میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

''کیا بات ہے بھیا؟''

اس پر شنکر نے گھبرا کر دروازے کی طرف دیکھا اور پھر بہت دھیمی آواز میں کپکپاتے ہوئے کہا۔

''بھیا! یہاں سے فوراً بھاگ جا۔ پدمنی اور اس کا شیطان بھائی تجھے جان گئے ہیں۔ وہ تجھے آج رات کالی دیوی کے مندر میں لے جا کر مار ڈالیں گے۔ لے یہ خنجر سنبھال اور جلدی سے بھاگ جا۔ وہ شیطان رام داس مندر سے پجاریوں کو لے کر آتا ہی ہوگا۔''

یہ سن کر میرے دماغ کے فیوز اڑ گئے۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں اتنی جلدی دھر لیا جاؤں گا۔ شنکر کی باتوں میں سچائی ہی سچائی تھی۔ وقت بہت کم تھا اور خطرہ بہت زیادہ۔ اس سے پہلے کہ شیطان رام داس اپنے دوسرے چیلوں کے ساتھ آ کر مجھے دھر لیتا، میں یہاں سے نکلنا چاہتا تھا۔ میں نے خراٹے لیتی رانی کو جھنجوڑ کر جگایا تو اس کے منہ سے ایک گندی گالی نکلنے سے پہلے ہی میں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا کہ کہیں اس کی آواز سن کر پدمنی الرٹ نہ ہو جائے۔ رانی نے گھبرا کر آنکھیں کھول لیں۔ مگر منہ پر ہاتھ ہونے کی وجہ سے چیختے چیختے رہ گئی۔

میں نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

''رانی چلو یہاں سے نکلو ہم دونوں دھر لیے گئے ہیں۔ پدمنی اور اس کا بھائی رام

داس ہمیں مارنے کا پروگرام بنا چکے ہیں۔ چلو اٹھو۔ اس سے پہلے کہ وہ لوگ یہاں پہنچیں۔''

''مگر کون لوگ؟'' رانی پریشان ہو کر بولی۔

میں نے اشارے سے اسے خاموش رہنے کا کہا اور دبی آواز میں بولا۔ ''رام داس پجاریوں کو لینے گیا ہے اور کچھ دیر میں آنے والا ہے۔ وہ لوگ ہمیں کالی دیوی کے مندر لے جا کر مارنا چاہتے ہیں۔''

''مگر انہیں کیسے پتا لگا؟'' وہ پھر بولی۔

میں نے اسے غصے سے گھورا۔ ''چلنا ہے تو چلو میں تو نکلا۔'' اتنا کہہ کر میں نے جوتے پہنے۔ اپنا بیگ اٹھایا۔ شنکر کے ہاتھ سے خنجر لیا اور اسے کمر کی جانب نیفے میں اڑس لیا اور اللہ کا نام لے کر دروازے سے باہر جھانکا۔ کونے والے دروازے سے ہلکی ہلکی روشنی باہر جھانک رہی تھی۔ میں نے شنکر کو اشارہ کیا کہ وہ پدمنی کو باتوں میں الجھائے تاکہ میں اور رانی نکل سکیں۔ اس نے فوراً کانوں کو ہاتھ لگایا اور بولا کہ اسے پدمنی کے عبادت خانے میں گھسنے کی اجازت نہیں ہے۔ میں نے تشکر آمیز نگاہوں سے اسے دیکھا اور برآمدے میں نکل آیا۔ رانی بھی جیسے تیسے کمرے سے نکل آئی۔ اچانک باہر کچھ لوگوں کے قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔ میں سمجھ گیا کہ رام داس اپنے چیلوں کو لے کر پہنچ گیا تھا۔ شنکر بھاگ کر اپنے کمرے میں گھس گیا۔ میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹیاں ''ٹن ٹن'' کرنے لگیں۔ خطرے سے نپٹنے کے لیے چند سیکنڈ ہی رہ گئے تھے۔ میں رانی کو ہاتھ سے کھینچتے ہوئے کچن کی طرف بھاگا۔ یہاں چاردیواری سے باہر کی جانب کودنا قدرے آسان تھا اس سے پہلے کہ بیرونی دروازہ کھلتا اور ہمارے دشمن اندر آتے میں اور رانی برتن رکھنے والے چبوترے سے دیوار پر چڑھ کر باہر کود چکے تھے۔ یہ پدمنی کے گھر کا پچھلا حصہ تھا اور جہاں ہم کودے تھے وہ شاید کچرے کا ایک ڈھیر تھا۔ اس لیے ہمیں کوئی چوٹ نہ لگی۔ اندھیرے میں میں نے ادھر اُدھر ہاتھ مار کر اپنا بیگ اٹھایا جو کودنے سے پہلے میں نے گرا دیا تھا رانی کا ہاتھ پکڑا اور ناک کی سیدھ میں سامنے کھیتوں کی جانب بھاگا۔ چار سو اندھیرا پھیلا ہوا تھا اور آسمان پر بادل ہونے کی وجہ سے تارے تک نظر نہیں آ رہے تھے۔ ایسے میں ہم گرتے پڑتے آگے بڑھتے رہے۔

اچانک ایک شور بلند ہوا۔ میں نے گھبرا کر مڑ کر دیکھا تو پدمنی کے گھر کی بتیاں روشن ہو چکی تھیں ہمیں نہ پا کر وہ لوگ غصے سے چیخ رہے تھے۔ خطرہ بے حد بڑھ چکا تھا وہ لوگ

یقیناً چیخ چیخ کر پورے قصبے کو جگا دیتے اور یہ جان کر کہ ایک مسلمان اس قصبے میں چھپ رہا ہے۔ ہر شخص ہمیں پکڑنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوتا اور میں فوراً ہی دھر لیا جاتا۔ اس لیے جتنا جلدی ممکن ہو سکتا۔ میں اور رانی یہاں سے دور بھاگتے جا رہے تھے۔ بھاگتے بھاگتے اچانک رانی نے چیخ کر کہا۔ ''یہ راستہ تو کھنڈروں کو جاتا ہے۔''

میں شاید رک کر اس طرف جانے کا ارادہ ترک کرتا کہ اچانک پیچھے سے بہت سے لوگوں کی آوازیں سنائی دیں۔ وہ لوگ ہمارے تعاقب میں تھے۔ اس لیے بچاؤ کی واحد جگہ وہ تاریک اور آسیب زدہ کھنڈرات ہی تھے اور رانی شاید وہاں جانے سے ڈر رہی تھی مگر یہ وقت ڈرنے کی بجائے جان بچانے کا تھا اس لیے میں نے اس کا ہاتھ مزید مضبوطی سے تھاما اور اسی سمت میں تیزی سے بھاگنے لگا۔ بھاگتے بھاگتے ہم تاریکی میں ڈوبی ہوئی اس کھنڈر نما عمارت کے قریب پہنچ گئے جو کہ تاراپور کے لوگوں کے لیے ایک خوفناک آسیب زدہ کھنڈر تھا مگر میری منزل تھا۔ رانی کھنڈرات کو دیکھ کر حواس باختہ ہو گئی تھی اور اس پر خوف کی وجہ سے کپکپی طاری ہو چکی تھی۔ پیچھے پورا تاراپور روشن ہو چکا تھا یقیناً رام داس نے ایک پاکستانی مسلمان کی آمد کا اعلان کر دیا تھا اس لیے کچھ اور سوچنا بے کار تھا مجھے صرف فکر اگر تھی تو وہ رانی کی تھی کہ اسے کھنڈرات کے اندر لے جانا بے حد خطرناک تھا اور کھنڈرات کے باہر اسے اکیلا یونہی چھوڑ دینا اسے موت کے منہ میں دھکیلنے کے مترادف تھا جو کہ میرے لیے اپنی محسنہ کے ساتھ کرنا ممکن نہ تھا۔ میں نے دل ہی دل میں ارادہ کر لیا کہ رانی کو ساتھ لے کر کھنڈرات میں گھس جاؤں گا اور اس کا کسی بھی شیطانی حربے سے ہر ممکن بچاؤ کروں گا۔ یہ سوچ کر میں نے تاریکی میں ڈوبے کھنڈرات نما حویلی کے صدر دروازے کی جانب دوڑ لگا دی اور رانی کے ہاتھ پر اپنی گرفت مضبوط کرتے ہوئے کہا۔

''رانی پریشان مت ہو۔ ان کھنڈرات میں رہنے والے آسیب ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے اگر ہم کھنڈرات میں نہ گئے تو گاؤں کے لوگوں کے ہاتھوں مارے جائیں گے۔'' یہ کہہ کر میں نے اپنی کمر پر نیفے میں اڑسے خنجر کو ٹٹولا۔ وہ موجود تھا۔ بے چاری رانی کیا کہتی۔ اندھیرے کے باوجود اس کی آنکھوں میں بھرے آنسو مجھے نظر آ گئے۔ جو کہ اس کے ڈر کی انتہا تھی۔ مگر ہمارے پاس کوئی چارہ نہ تھا اور یہ بات رانی بھی بہت اچھی طرح سمجھتی تھی۔ اس لیے وہ بھی میرے ساتھ قدم ملا کر بھاگتی گئی۔ بھاگتے بھاگتے ہم حویلی کے صدر

دروازے پر پہنچ گئے۔ میں نے ایک بار مڑ کر اس جانب نظر ڈالی۔ جہاں سے لوگوں کی آوازوں کا شور آ رہا تھا۔ وہاں اب خاموشی تھی۔ وہ لوگ شاید اس بات پر مطمئن ہو گئے تھے کہ ہم نے کھنڈرات کا رخ کر لیا تھا اور اب ہماری زندہ واپسی ممکن ہی نہ تھی۔ اس طرف سے مطمئن ہو کر میں نے اللہ کا نام لیا اور کھنڈر حویلی کے صدر دروازے سے اندر داخل ہو گیا۔ رانی میرا ہاتھ تھامے میرے پہلو سے لگ کر ساتھ ساتھ چل رہی تھی، وراس کے دل کی تیز دھڑکن میں اس تاریک خاموشی میں بہت صاف سن سکتا تھا۔ جیسے ہی ہم حویلی کے دروازے سے اندر داخل ہوئے۔ پوری حویلی دردناک چیخوں سے لرز اٹھی۔ ایسی خوفناک دھاڑیں جیسے کسی انسان کو ذبح کیا جا رہا ہو۔ پھر یہ چیخیں زوردار قہقہوں میں بدل گئیں۔ رانی خوف کے مارے مجھ سے لپٹ گئی۔ میں نے اسے حوصلہ دیا مگر میں خود بھی حواس باختہ ہوا جا رہا تھا۔ میں ابھی دو تین قدم ہی آگے بڑھا تھا کہ مجھے چاروں طرف سے گہری سانسوں کی آواز سنائی دی۔ میں رک گیا۔ میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھا تو خوف کی ایک لہر میرے بدن میں دوڑ گئی۔ وہی سینکڑوں خوفناک آنکھیں مجھے گھور رہی تھیں۔ جو مجھے تاراپور کے راستے میں گھورتی نظر آئی تھیں۔ پھر یہ آنکھیں مجھے اپنے قریب آتی نظر آئیں۔ چاروں طرف سانسوں کی آواز اور زیادہ گہری ہو گئی۔ یوں لگ رہا تھا۔ جیسے ہمارے چاروں طرف سینکڑوں لوگ ہمیں گھیرے ہوئے تھے۔ اچانک ہمارے بالکل قریب سے ایک انتہائی دردناک چیخ اٹھی اور رانی مجھ سے ہاتھ چھڑا کر صدر دروازے سے باہر کی جانب بھاگی شاید اس کے نزدیک اس خوفناک ماحول میں ہارٹ فیل ہونے کی بجائے باہر گاؤں والوں کے ہاتھوں مرنا زیادہ بہتر تھا۔ میں اس کے پیچھے اسے روکنے کے لیے بھاگا مگر میرے قدم تو جیسے منوں بھاری ہو گئے رانی چیختی چلاتی باہر نکل گئی اور میں اسے روکنے کی کوشش میں ناکام ہو گیا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ سوچتا سمجھتا۔ میرے پاؤں زمین سے خود بخود اٹھنے لگے اور میں چھت سے کچھ انچ نیچے ہوا میں معلق ہو گیا۔ شعلہ برستی لال خوفناک آنکھیں اب بھی مسلسل مجھے گھور رہی تھیں۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور اسم اعظم کا ورد کرنے لگا۔ حویلی ایک بار پھر دردناک چیخوں سے لرز اٹھی اور مجھے ایک بہت زور کا دھکا لگا میں اڑتا ہوا سیڑھیوں کے زینے پر آ گرا۔ تکلیف کے مارے میرے منہ سے آہ نکل گئی۔ اس سے پہلے کہ میں سنبھلتا۔ میرا جسم ایک بار پھر ہوا میں معلق

اسم اعظم کا ورد شروع کر دیا اور اسی لمحے ایک اور زوردار دھکے سے اڑتا ہوا میں سامنے کی دیوار سے ٹکرا گیا۔ میرا سر لہولہان ہو گیا۔ قہقہوں اور چیخوں کی آواز بلند ہونے لگی اچانک پہلی منزل پر ایک کمرہ روشن ہو گیا۔ میں اپنی تکلیف بھلا کر سیڑھیاں پھلانگتا ہوا اس کمرے کی جانب بھاگا۔ کمرے کے قریب پہنچ میں رک گیا۔ اندر کچھ انسانی حرکت محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ کمرے کے اندر جھانکا۔ سامنے مسہری پر ایک عورت بال کھولے میری جانب پیٹھ کیے بیٹھی تھی۔ میں نے ہمت کر کے اسے آواز دی۔

''سنو تم کون ہو اور یہاں کیا کر رہی ہو؟''

وہ عورت میری جانب مڑی اور میرے منہ سے ''اوہ میرے خدا'' نکل گیا۔ میرے سامنے رانی بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کی حالت بری ہو رہی تھی۔ اس کے چہرے پر گہرے زخموں کے نشان تھے۔ جیسے نوکیلے پنجوں سے اس کے چہرے کو کریدا گیا ہو۔ اس کا بائیں جانب کا آدھا کان کٹا ہوا تھا۔ جس میں سے خون رس رہا تھا۔ انگلیوں کے ناخن اترے ہوئے تھے اور ہونٹ پھٹ چکے تھے۔ جن میں سے خون بہہ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بے حد تکلیف کے آثار نمایاں تھے۔ وہ روتے روتے بولی۔ ''وجاہت تم واپس چلے جاؤ ورنہ یہ شیطانی روحیں مجھے مار ڈالیں گی۔''

میں نے اس کے قریب جا کر کہا۔ ''لیکن میں اپنی امانتیں لے کر جاؤں گا۔''

یہ سننا تھا کہ رانی آپے سے باہر ہو گئی اور چیخ کر بولی۔ ''دیکھو تم نے میرے احسان کا کیا بدلہ دیا ہے۔ مجھے موت کے منہ میں دھکیل دیا اب میری جان اسی طرح بچ سکتی ہے کہ تم ابھی اسی وقت لوٹ جاؤ۔''

میں نے پرعزم ہو کر کہا۔ ''نہیں رانی۔ آج میں اپنی امانتیں لے کر ہی جاؤں گا۔'' یہ کہنا تھا کہ رانی کی چیخیں بلند ہو گئیں۔ جیسے کوئی اس کو مار رہا ہو اور پھر میرے دیکھتے دیکھتے ہی اس کے چہرے کا گوشت ادھڑنے لگا۔ اس کی ایک آنکھ ابل کر باہر گر گئی۔ ہونٹ چھٹنے لگے۔

وہ چیخنے لگی۔ ''وجاہت مجھے بچاؤ۔ یہاں سے چلے جاؤ ورنہ یہ شیطان مجھے مار ڈالیں گے۔''

میں نے اس کی یہ حالت دیکھ کر فوراً اپنی جیب سے فقیر بابا کی دی ہوئی کراماتی تسبیح

نکالی اور اللہ کا نام لے کر رانی کے پھٹتے ہوئے جسم کی طرف اچھال دی۔ تسبیح کا رانی کے جسم کو چھونا تھا کہ دردناک چیخوں سے کھنڈرات لرز اٹھے مگر یہ دردناک چیخیں رانی کی نہ تھیں بلکہ اچانک رانی کا چہرہ بالکل ٹھیک ہو گیا۔ جیسے اس کے چہرے پر کوئی زخم کبھی تھا ہی نہیں مگر اگلے لمحے وہ ہوا میں معلق ہو گئی میں نے بھاگ کر اپنی تسبیح اٹھائی اور اس سے پہلے کہ میں کچھ کرتا رانی کا زندہ جسم اڑتا ہوا حویلی کے صدر دروازے سے باہر نکل گیا میں صرف اس کی چیخیں ہی سنتا رہ گیا میں سمجھ گیا تھا کہ رانی شیطان کے چیلوں کے حصار میں جکڑی جا چکی تھی۔ اسے بچانا بھی بہت ضروری تھا مگر کیسے! فی الحال تو مجھے اس تہہ خانے تک پہنچنا تھا جو میرے مرحوم دادا کے بیڈ روم میں تھا۔ مجھے حویلی کا تھوڑا بہت نقشہ میری والدہ نے سمجھا دیا تھا۔ اس لیے مجھے دادا مرحوم کا بیڈ روم ڈھونڈنے میں دشواری کا خدشہ کم تھا۔ میں بالائی منزل پر تھا اور اماں کے کہنے کے مطابق دادا (مرحوم) کا کمرہ سیڑھیاں چڑھتے ہی انتہائی دائیں جانب تھا۔ میں اس لیے دائیں جانب کے آخری کمرے کی جانب بھاگا۔ بھاگتے ہوئے مجھے احساس ہوا کہ جتنا میں آگے بڑھ رہا تھا وہ کمرہ اتنی ہی دور ہوتا جا رہا تھا۔ میں نے باآواز بلند اسم اعظم کا ورد کرتے ہوئے کمرے تک پہنچنے کی کوشش جاری رکھی۔ اللہ کے فضل سے میں کمرے تک پہنچ گیا کمرے کا دروازہ بند تھا میں نے ہلکے سے دھکے سے اسے کھولا تو دروازہ چرچراتے ہوئے کھلتا ہی گیا۔ اندر کمرے میں گھپ اندھیرا تھا میں نے ہمت کر کے کمرے کے اندر قدم رکھا اور میرے منہ سے ''اوہ'' کی آواز نکل گئی میرے پاؤں رکھنے کی جگہ پر کوئی زمین ہی نہ تھی اور اگلے ہی لمحے میں گہرے اندھیرے میں گرتا چلا جا رہا تھا۔ حویلی میں قہقہے گونج رہے تھے۔

☆======☆======☆

میں گہرائیوں میں گرتا جا رہا تھا اور چاروں طرف سے وہی خوف ناک انگارہ آنکھیں مجھے گھور رہی تھیں۔ میرا دماغ ماؤف ہونے لگا تھا۔ اس سینکڑوں فٹ کی بلندی سے نیچے گر کر میرے پرزے پرزے ہو جاتے اور اسی خوف سے میں نے آنکھیں بند کر لیں اور پھر میری زبان پر رب کریم کے نام کا ورد جاری ہو گیا۔ ساتھ ہی میرا ذہن تاریک ہوتا چلا گیا۔

اچانک میں نے اپنے آپ کو اونچے ستونوں والے ایک احاطے میں کھڑا پایا۔ وہی

منظر جو انہی بزرگ کے مزار کا تھا جہاں وہ میرے سامنے تشریف فرما تھے۔ ان کے قریب ہی دادا مرحوم اور ابا جان کو کھڑے پایا۔ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد وہ بندۂ خدا مجھ سے گویا ہوئے۔

''وجاہت میاں! تمہیں تمہاری منزل مبارک ہو۔ اب ان امانتوں کی حفاظت تمہاری ذمے داری ہے۔'' یہ کہتے ہوئے انہوں نے ایک بکس کی جانب اشارہ کیا اور پھر فرمایا۔ ''اب ان طاغوتی قوتوں کے خلاف جہاد کرنا اور راہِ حق پر قائم رہنا۔'' اتنا کہہ کر وہ بزرگ اپنے فدائین سمیت نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

میں دھیرے سے بکس کی جانب بڑھا اور اسے کھولنے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ کانپتے ہاتھوں سے بکس کو کھولا تو اس میں قرآن پاک کا ایک نہایت قدیم نسخہ موجود تھا۔ ساتھ ہی ایک چھوٹی سی سبز رنگ کی ڈبیا تھی۔ اسے کھولا تو اس کے اندر یاقوتی نگینے والی ایک انگوٹھی تھی۔ جیسے ہی میں نے انگوٹھی کو ہاتھ لگایا۔ آس پاس کا ماحول دردناک چیخوں سے لرز اٹھا پھر اچانک ہی وہ بکس میری آنکھوں سے اوجھل ہو گیا اور آس پاس گہری تاریکی سی چھا گئی۔ مجھے یوں لگا جیسے میرا ذہن ایک بار پھر گہرے اندھیروں میں ڈوبا جا رہا ہو۔

☆======☆======☆

میری آنکھ کھلی تو میں ایک اندھیرے کمرے کے فرش پر پڑا ہوا تھا۔ کچھ لمحے تو میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اِدھر اُدھر دیکھتا رہا اور سوچتا رہا کہ کیا میں زندہ ہوں یا میری روح کہیں بھٹک رہی ہے۔ مگر پھر میں پچھلے واقعات دہرانے لگا اور مجھے یاد آیا کہ کس طرح میں اپنے دادا کے کمرے میں داخل ہوتے ہی کسی گہری کھائی میں گرا تھا اور گرتے ہوئے شاید بے ہوش ہوگیا تھا۔ جہاں بے ہوشی کے عالم میں' میں نے ان درویش بابا کی زیارت کی اور ان سے اپنی منزل کو پانے کی بشارت سنی۔ اللہ کے کرم سے میں کچھ زیادہ اونچائی سے نہیں گرا تھا اور شاید اسی لیے مجھے زیادہ چوٹ نہیں آئی۔ بس ہلکی خراشیں لگی تھیں۔ اب جو آنکھیں ذرا دیکھنے کے قابل ہوئیں تو مجھے اندازہ ہوا کہ میں ایک تہہ خانے کے کمرے میں تھا اور یہاں سے کچھ ٹوٹی پھوٹی سیڑھیاں بھی اوپر جاتی دکھائی دے رہی تھیں۔ دراصل حویلی کے در و دیوار کی حالت اس قدر خستہ تھی کہ دادا کے کمرے کا فرش نیچے موجود تہہ خانے میں گر چکا تھا۔ اسی لیے میں کمرے میں داخل ہوتے ہی گرا تو سیدھا تہہ خانے میں پہنچ گیا۔

اچانک مجھے اس بکس کا خیال آیا جو میں نے خواب میں دیکھا تھا۔ میں نے دائیں بائیں نگاہیں دوڑائیں تو مجھے سیڑھیوں کے پیچھے اندھیرے میں ویسا ہی بکس پڑا ہوا دکھائی دیا جو میں نے خواب میں دیکھا تھا۔ میں نے ہمت کی اور اللہ کا نام لے کر بکس کے قریب پہنچ گیا۔

کانپتے ہاتھوں سے میں نے اسے کھولنے کے لیے ہاتھ بڑھائے مگر اچانک ہی ایک کالا ناگ سیڑھیوں کے نیچے سے نکلا اور کنڈلی مار کے بکس کے اوپر آ بیٹھا۔ وہ اپنی لال لال آنکھوں سے مجھے گھورنے لگا۔ ساتھ ہی وہ اپنا پھن لہرانے لگا اس کی کالی دو شاخہ زبان بار بار باہر نکل رہی تھی اور وہ مجھ پر حملہ کرنے کی تیاری کر رہا تھا۔

میں اس ناگہانی صورت حال کے لیے بالکل تیار نہ تھا مگر جان بچانے کے لیے اس

آفت کا مقابلہ کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ مگر میں کس طرح اس سے نپٹتا؟ اچانک مجھے اپنے نیفے میں اڑسے ہوئے خنجر کا خیال آیا جو تارا پور میں شنکر نے فرار ہوتے ہوئے میرے حوالے کیا تھا۔ میں نے ہاتھ ڈال کر خنجر نکالا اور اس منحوس ناگ پر نظریں جما کر اس پر حملے کے لیے پینترے بدلنے لگا۔ ناگ نے میرے ہاتھ کو لہراتے دیکھا تو اس نے جھومنا بند کر دیا' پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس کا سائز بڑھنے لگا اور چند لمحوں میں وہ ایک عظیم الجثہ اژدھا بن گیا۔ اب اس کا پھن حویلی کی چھت سے ٹکرانے لگا اور اس کے منہ سے دو شاخہ زبان کے ساتھ آگ کے شعلے بھی نکلنے لگے۔ میری تو جیسے سٹی گم ہوگئی۔ ناگ کا روپ بدلنے کے بارے میں تو بہت سنا تھا مگر اس طرح جسامت بدل جانے کا کبھی نہیں سنا تھا مگر آج اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں سنبھلتا وہ اژدھا بجلی کی طرح مجھ پر جھپٹا اور عین میرے چہرے کے قریب آ کر اس کا پھن رک گیا' پھر وہ انسانی زبان میں گویا ہوا۔
''اے مردود! میں تجھے ایک موقعہ دیتا ہوں۔ الٹے پاؤں بھاگ جا ورنہ ایک ہی پھونک میں تجھے بھسم کر دوں گا۔''

میں سمجھ گیا کہ یہ ناگ نما مخلوق دراصل شیطانی چال ہے اس لیے میں نے خدا کا نام لے کر اپنے ہاتھ میں پکڑے خنجر سے اس کے پھن پر وار کیا مگر وہ بلا پھرتی سے اچھل کر پیچھے ہٹ گئی' پھر وہ کسی بجلی کی طرح مجھ پر جھپٹی اور آن کی آن میں مجھے نگل لیا مجھے ایسا لگا جیسے میں کسی دہکتے تندور کے اندر پھسلا جا رہا ہوں۔ میری سانس رکنے لگی اور ذہن پر اندھیرا چھانے لگا۔ میں نے دل ہی دل میں اسم اعظم کا ورد کیا اور اپنے ہاتھ میں تھامے خنجر کو دائیں بائیں چلانا شروع کر دیا۔

اچانک دردناک چیخوں کی آواز سنائی دی اور پھر مجھے یوں لگا جیسے میں کہیں کھنچا جا رہا ہوں۔ اگلے ہی لمحے میں ہوا میں لہراتا ہوا دیوار سے ٹکرایا اور فرش پر نیچے گر گیا۔ میں نے دیکھا کہ میرا جسم خون سے اٹی گندی سی ایک جھلی میں پھنسا ہوا تھا۔ میں نے جلدی جلدی وہ جھلی اپنے جسم سے ہٹائی اور کھڑا ہوگیا۔ سامنے اژدھا تڑپ رہا تھا اور اس کے پھن میں سے خون کے فوارے نکل رہے تھے۔ پھر اچانک ہی وہ غائب ہوگیا میں سمجھ گیا کہ شیطانی مخلوق کو اسم اعظم کی ضرب لگی تھی۔ میں نے مزید وقت ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا اور فوراً اس بکس کی جانب بڑھا جس کے لیے اب تک اتنے پاپڑ بیلنے پڑ رہے تھے۔

بکس کھلتے ہی مجھے بالکل ویسا ہی قرآن پاک کا نسخہ نظر آیا جو میں نے خواب میں دیکھا تھا۔ میں نے کتاب مقدس کو چوما آنکھوں سے لگایا اور پھر ہاتھ بڑھا کر وہ سبز رنگ کی ڈبیا اٹھالی۔ جس میں کراماتی انگوٹھی تھی۔ جسے پہن کر میں اپنی نسلوں کو محفوظ کر سکتا تھا۔ میں نے ورد کرتے ہوئے ڈبیا کو کھولا تو اندر یاقوتی نگینے سے جڑی انگوٹھی موجود تھی۔ میں نے ایک لمحے کو اسے بڑی عقیدت سے دیکھا۔

اچانک مجھے اپنی چاروں طرف سے پھنکارنے کی آوازیں سنائی دیں میں نے تیزی سے مڑ کر دیکھا تو سینکڑوں کی تعداد میں کالے ناگ پھن لہراتے' دوشاخہ زبانوں سے پھنکارتے ہوئے مجھ پر جھپٹنے کے لیے تیار تھے۔ کئی سانپ میری ٹانگوں سے لپٹ چکے تھے۔

اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کرتے میں نے بجلی کی سی تیزی سے بلند آواز سے اسم اعظم کا ورد کرتے ہوئے اپنے اجداد کی کراماتی انگوٹھی اپنے دائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی میں پہن لی۔ انگوٹھی پہنتے ہی مجھے ایسا لگا۔ جیسے میرے جسم میں حرارتی لہریں دوڑنے لگی ہوں' پھر مجھے یوں لگا جیسے میرے اردگرد ہر چیز منجمد ہوگئی ہو۔ چاروں طرف پھن لہراتے ناگ' دیواروں میں سے جھانکتی خوف ناک لال لال آنکھیں اور پُراسرار دلدوز چیخیں سب کچھ منجمد تھا۔ پھر آنگوٹھی کے نگینے سے ایک لہر نکلی اور مجھے ہر چیز اس لہر کے ساتھ اڑتی ہوئی دکھائی دی۔ کچھ لمحوں تک گرد و غبار دکھائی دیا اور پھر چاروں طرف مکمل خاموشی ہوگئی۔

☆======☆======☆

پہاڑی پر موجود کالی دیوی کے مندر میں دردناک چیخیں سنائی دیں۔ شیام پجاری کی ناک سے خون کے گویا فوارے جاری تھے اور وہ کالی دیوی کے بت کے سامنے اپنے ماتھے کو بار بار فرش سے ٹکرا رہا تھا۔ جس سے اس کی پیشانی پھٹ چکی تھی۔ وہ وجاہت کو روکنے میں ناکام ہو چکا تھا اور ایسا کرنے میں اس کے کئی شیطان چیلے ختم ہو چکے تھے مگر وہ ابھی جنگ نہیں ہارا تھا۔ اسے چالیس دن کے اندر اندر کچھ کرنا تھا ورنہ وجاہت کی سات نسلیں بھی اس کے شیطانی حربوں سے محفوظ ہو جاتیں اور ایسا ہونا اس کی دیوی کی منشا کے خلاف تھا مگر اسے یقین تھا کہ وجاہت اس کے پاس آ رہا ہے کیوں کہ پاس ہی ستون کے ساتھ رانی زخمی حالت میں بندھی ہوئی تھی۔

☆======☆======☆

حویلی کے تہہ خانے میں دوسرے کئی قیمتی نوادرات بھی موجود تھے مگر حالات ایسے نہ تھے کہ میں انہیں لے جا سکتا۔ ہاں قرآن پاک کا نسخہ میں نے رکھ لیا اور حویلی سے باہر نکل آیا۔ اب مجھے رانی کی فکر لاحق ہو رہی تھی کہ وہ کہاں اور کس حال میں ہوگی۔ صبح ہونے میں ابھی کچھ دیر تھی۔ میں نے بھاگ بھاگ کر پوری حویلی کا چکر لگایا مگر رانی کا کچھ پتا نہ چلا۔ گاؤں کی جانب ایک نظر دوڑائی تو وہاں خاموشی کا عالم تھا۔ یقیناً گاؤں والے اس یقین کے ساتھ پُرسکون تھے کہ حویلی سے کسی ذی روح کا زندہ لوٹنا ناممکن تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں؟ رانی کو ساتھ لیے بغیر سفر کرنا انتہائی خطرناک تھا۔ پھر اس کی زندگی کی حفاظت کا ذمے دار بھی میں تھا اور ان حالات میں اسے یوں چھوڑ کر جانا میرے اصولوں کے سخت خلاف تھا۔ میں نے تہیہ کر لیا کہ جب تک رانی کا پتا نہیں چلے گا میں ہرگز یہاں سے نہیں جاؤں گا مگر اس کا پتا کیسے چلے گا؟ یہ سوچ سوچ کر میں پریشان ہوا جا رہا تھا۔

اچانک مجھے خیال آیا کہ کیوں نہ رانی کی سہیلی پدمنی اور اس کے بھائی رام داس سے اگلوایا جائے کہ رانی کہاں ہو سکتی ہے مگر گاؤں میں واپس جانا زندگی سے ہاتھ دھونے کے مترادف تھا۔ صبح ہونے میں بہ مشکل آدھ پونے گھنٹے کی دیر تھی اور دن کی روشنی میں گاؤں والوں کی نظروں سے ایک اجنبی کا بچ نکلنا ناممکن تھا۔

لیکن اگر تاخیر کرتا تو رانی کی زندگی کو خطرہ لاحق ہو سکتا تھا۔ یہی سوچ کر میں نے اللہ کا نام لیا اور گاؤں کا رخ کیا۔ چھپتا چھپاتا میں کسی نہ کسی طرح پدمنی کے گھر تک پہنچ گیا۔

گھر کی پچھلی جانب میں احاطے میں کودا۔ گھر میں مکمل خاموشی تھی مگر پوجا والا کمرا ابھی تک روشن تھا اور اندر کوئی دبی دبی آواز میں بڑبڑا رہا تھا۔ میں نے شنکر کا دیا ہوا خنجر ہاتھ میں مضبوطی سے تھام لیا اور دبے پاؤں پوجا والے کمرے کی جانب بڑھا۔ دروازے پر پہنچ کر میں نے دروازے کی ایک درز سے اندر جھانکا۔ رام داس کالی دیوی کے بت کے سامنے ماتھا ٹیکے گڑگڑا رہا تھا۔ ''کالی ماں مجھے معاف کر دے۔ تیرا دشمن میرے قابو سے نکل گیا۔ کالی ماں مجھے معاف کر دے۔''

میں نے ایک گہرا سانس لیا اور وقت ضائع کیے بغیر بجلی کی سی تیزی سے کمرے کے اندر گھس گیا۔ اس سے پہلے کہ رام داس کالی دیوی کے بت کے سامنے ٹکا ہوا سر اٹھاتا اور صورتِ حال کو سمجھتا میں نے خنجر اس کی گردن پہ ٹکا دیا۔ ساتھ ہی بایاں ہاتھ اس کے منہ پر جما دیا۔

رام داس کی آنکھیں خوف سے پھٹ گئیں۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس کا بدترین دشمن اس کے قبضے سے نکل کر یوں دوبارہ اس کے سامنے آ جائے گا مگر اب وہ میرے قابو میں تھا۔ میں نے خنجر کی نوک اس کی گردن پر دباتے ہوئے غرا کر پوچھا۔ ''بتاؤ رانی کہاں ہے ورنہ ابھی گردن کاٹ دوں گا۔''

وہ بھلا کیا بولتا۔ اس کے منہ پر میرا ہاتھ اتنی مضبوطی سے جما ہوا تھا کہ اس کی سانس تک اکھڑ رہی تھی۔ میں نے اپنا ہاتھ اس کے منہ سے ہٹایا اور دوبارہ اس سے وہی سوال کیا۔ رام داس پر کپکپی طاری تھی اس لیے اس کے حلق سے آواز نہیں نکل پا رہی تھی۔ میں نے خنجر کی نوک سے اس کی گردن کو ذرا سا چرکا لگایا تو وہ رو پڑا۔

میں نے پھر غرا کر پوچھا۔ ''دیکھو رام داس اگر تو نے مجھے نہ بتایا کہ رانی کدھر ہے تو میں تجھے تیری اسی دیوی کے چرنوں میں ذبح کر ڈالوں گا۔ بول رانی کہاں ہے؟''

وہ کپکپاتے ہوئے بولا۔ ''وہ...... وہ رانی...... پہاڑی والے مندر میں...... شیام پجاری کے قبضے میں ہے۔''

''اور یہ پہاڑی والا مندر کدھر ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ...... وہ' گاؤں کے پورب میں۔ جدھر سے سورج نکلتا ہے۔'' وہ کپکپاتے ہوئے بولا۔

میں نے اس کے منہ میں کپڑا ٹھونسا اور اس کے کپڑوں کو پھاڑ کر اس کے ہاتھ پاؤں باندھ دیے۔ یہاں سے فارغ ہو کر میں مڑا ہی تھا کہ کوئی بھاری چیز میرے سر سے آ ٹکرائی۔ میرا ذہن اندھیروں میں ڈوبنے لگا مگر مجھے پدمنی کا چہرہ نظر آ گیا تھا۔ جس کے ہاتھ میں اینٹ تھی جو اس نے میرے سر پر دے ماری تھی۔

☆======☆======☆

دھرم سنگھ' وجاہت اور رانی کو چھوڑ کر قصبے میں موجود ایک ڈرائیور ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا۔ وہ یہ سب کرتے ہوئے بڑا پریشان ہو گیا تھا کیوں کہ اگر تارا پور کے اس قصبے میں موجود انتہا پسندوں کو علم ہو جاتا کہ وہ ایک پاکستانی مسلمان کی مدد کر رہا ہے تو وہ شاید اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے کتوں کو ڈال دیتے یا پھر زندہ جلا ڈالتے مگر سرداری ذہنیت اسے مجبور کر رہی تھی کہ وہ وہیں پر جما رہے اور وجاہت اور رانی کا انتظار کرے۔ اس خیال نے اسے

مطمئن کر دیا تھا مگر رات کے آخری پہر گاؤں میں زبردست ہنگامے نے اسے ڈرا دیا تھا اور کچھ ہی دیر میں ہوٹل میں موجود بیروں کو اس نے کھسر پھسر کرتے سن لیا تھا کہ گاؤں میں کوئی مسلمان گھس آیا تھا جس کے ساتھ ایک سکھ لڑکی بھی تھی اور وہ دونوں جان بچاتے بچاتے پُراسرار کھنڈرات میں گھس گئے تھے۔ جہاں سے ان دونوں کا زندہ بچ جانا ناممکن تھا۔

یہ سن کر اس کی روح فنا ہو گئی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ دونوں یقیناً کسی بڑی مشکل میں پھنس گئے تھے۔ یہ خیال آتے ہی اس نے تہیہ کیا کہ کسی بھی طریقے سے وجاہت اور رانی کو ڈھونڈا جائے مگر کیسے؟ اس وقت رات کا آخری پہر تھا اور صبح تک انتظار کرنا اسے مناسب نہیں لگ رہا تھا۔

کچھ سوچ کر اس نے کھنڈرات کی طرف جانے کا ارادہ کیا مگر ایک انجانے خوف نے اسے جکڑ لیا پھر اسے اپنے نام کے دھرم اور سنگھ کی لاج کا خیال آیا تو مزید کچھ بھی سوچے بغیر اس نے اپنے کرتے میں لگی کرپان کو مضبوطی سے تھاما اور یہ فیصلہ کر کے اٹھا کہ فوراً ہی کھنڈرات میں پہنچ کر رانی اور وجاہت کی مدد کی جائے۔

اس نے ہوٹل کے رسوئی گھر میں موجود اونگھتے ہوئے بیرے سے پوچھا۔ ''یارا اے کھنڈرات کدھر ایں۔''

بیرے نے برا سا منہ بنا کر پوچھا۔ ''کیوں سردار جی جانے کا ارادہ ہے؟''

سردار جی نے برا سا منہ بنایا اور بولا۔ ''نہیں یار ویسے ہی پچھ واواں' کدھرے غلطی نال اودھر نہ چلا جاواں۔''

بیرے نے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''سردار جی۔ یہ جو سڑک ہے۔ ذرا آگے جا کے اس سے الٹے ہاتھ ایک کچی سڑک نکلتی ہے۔ جو سیدھی کھنڈرات کو جاتی ہے۔ ویسے وہ راستہ گاؤں والوں نے بند کر دیا ہے تاکہ کوئی تمہارے جیسا بھولا بھٹک کر ادھر نہ چلا جائے۔ چل چل اب سو جا۔ کھنڈرات کی زیادہ باتیں نہ کر ورنہ چڑیلیں یہاں آ جائیں گی تجھ سے ملنے۔'' بیرے نے اسے ڈراتے ہوئے کہا اور پھر لحاف اوڑھ کر اونگھنے لگا۔

دھرم سنگھ اپنی ٹیکسی میں آ کر بیٹھ گیا اور کچھ دیر اونگھنے کے انداز میں خاموش بیٹھا رہا تاکہ کوئی اسے جاتا نہ دیکھ لے۔ مطمئن ہو کر اس نے بڑی احتیاط سے گاڑی اسٹارٹ کی اور ہیڈ لائٹ آن کیے بغیر گاڑی موڑی اور اس سڑک کی جانب چل پڑا جدھر بیرے نے اشارہ

کیا تھا۔ بڑی خاموشی سے نکلتے ہوئے اس نے سڑک پر کھڑی دو گائیں ہٹانے کے لیے زور زور سے ہارن بجایا اور آگے بڑھ گیا۔ ہارن کی آواز سن کر بیرے نے آنکھیں کھول کر اس کی گاڑی کو جاتے حیرت سے دیکھا اور پھر آنکھیں موند لیں۔

☆======☆======☆

جلد ہی دھرم سنگھ حویلی کے قریب پہنچ چکا تھا۔ صبح ہونے کو تھی اور اسے جلدی تھی کہ وجاہت اور رانی کو لے کر دن نکلنے سے پہلے پہلے ہی تاراپور کو چھوڑ جائے۔ ابھی وہ اپنی ٹیکسی سے اترا ہی تھا کہ اس نے حویلی سے ایک سایہ بھاگتے ہوئے دیکھا۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کرے؟ پھر کچھ سوچے سمجھے بغیر اس نے اس سائے کے پیچھے دوڑ لگا دی۔ وہ سایہ گاؤں کی طرف بھاگا جا رہا تھا اور پھر وہ ایک گھر میں کود گیا۔ دھرم سنگھ رک گیا۔

اچانک اسے کرنٹ سا لگا۔ یہ گھر تو رانی کی سہیلی پدمنی کا تھا اور اندر کودنے والا کون تھا؟ وہ یہ معلوم کرنا چاہ رہا تھا۔ ابھی وہ بھی گھر میں کودنے کی تیاری ہی کر رہا تھا کہ اسے اندر سے ایک دلدوز چیخ سنائی دی اور وہ چیخ سن کر سکتے میں آ گیا۔ یہ کچھ جانی پہچانی آواز تھی...... اس نے دماغ پر زور دیا مگر اسے کچھ یاد نہ آیا اور پھر وہ بجلی کی تیزی سے دیوار پر چڑھ کر اندر جھانکنے لگا اور اندر کا منظر دیکھ کر کانپ گیا۔

☆======☆======☆

پدمنی نے پوری قوت سے اینٹ وجاہت کے سر کے پچھلے حصے پر دے ماری تھی جو اس کے بھائی رام داس کی گردن پر خنجر لگائے کھڑا تھا۔ وہ کچھ دیر کے لیے عبادت ختم کر کے اپنے کمرے میں گئی تھی۔ جہاں شنکر بے خبر سو رہا تھا اور جب وہ واپس پوجا گھاٹ پر آئی تو اس نے وجاہت کو اس کے بھائی پر خنجر لہراتے دیکھا۔ تب اس نے بڑی چالاکی سے دبے پاؤں آگے بڑھ کر وجاہت کو اینٹ سے ضرب لگا کر بے ہوش کر دیا تھا۔

رام داس ابھی تک ایک خوف وکپکپی کے عالم میں تھا مگر پھر اس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور وجاہت کو دیکھ کر شدید نفرت سے بولا۔ ''پدمنی! جلدی سے اسے باندھ کر مندر لے جانا ہے۔ اگر اب یہ ہمارے قابو سے نکل گیا تو کالی دیوی ہمیں بھسم کر دے گی۔''

پدمنی فوراً اپنے کمرے کی طرف بھاگی۔ کچھ دیر بعد وہ ایک بڑا سا کمبل لے آئی۔ اس کے ہاتھ میں رسی کا ایک بڑا ٹکڑا بھی تھا۔ ان دونوں نے جلدی جلدی وجاہت کو کمبل

میں لپیٹا اور رسیوں سے کس کر باندھ دیا۔ وہ دونوں سورج نکلنے سے پہلے کالی دیوی کے مندر پر وجاہت کو پہنچانا چاہ رہے تھے کیوں کہ اگر گاؤں والوں کو اس مسلمان لڑکے کی موجودگی کا پتا لگ جاتا تو وہ اپنی انتہا پسندی کی تسکین کے لیے وجاہت کو ان سے چھین کر فوراً ہی جلا ڈالتے اور ان دونوں کا مقصد پورا نہ ہوتا کیوں کہ وہ کالی دیوی کے چرنوں میں خود اپنے ہاتھوں سے اس مسلمان کا سر کاٹ کر پیش کرنا چاہ رہے تھے تاکہ دیوی ان پر مہربان ہو اور انہیں شیطانی قوتوں سے مالا مال کر دے۔

انہوں نے جلدی سے وجاہت کے کمبل میں بندھے جسم کو اٹھایا اور پوجا گھاٹ سے باہر نکلنے لگے مگر اچانک ٹھٹک کر رک گئے۔ سامنے ایک لمبا چوڑا سکھ ہاتھ میں کرپان لیے کھڑا انہیں گھور رہا تھا۔

☆======☆======☆

دھرم سنگھ ساری صورت حال سمجھ چکا تھا۔ اس سے پہلے کہ پدمنی یا رام داس کوئی حرکت کرتے۔ دھرم سنگھ کی کرپان لہرائی اور رام داس کی گردن کاٹتی ہوئی گزر گئی۔ رام داس کا گردن کٹا جسم تڑپنے لگا۔ اب دھرم سنگھ پدمنی کی طرف مڑا مگر وہ ہاتھ جوڑ کر دھرم سنگھ کے قدموں میں گر کے معافی مانگنے لگی۔ دھرم نے اسے بالوں سے کھینچا اور غرایا۔ ''بتاؤ رانی کہاں ہے؟''

پدمنی سہمے انداز میں بولی۔ ''وہ تو .... پہاڑی والے مندر...... میں شیام پجاری کی قید میں ہے۔''

''ٹھیک ہے تم فوراً اس کی رسیاں کھولو اور اگر ذرا سی بھی چالاکی دکھانے کی کوشش کی تو گرو کی قسم' کاٹ کر رکھ دوں گا۔'' دھرم غرایا۔

پدمنی نے فوراً وجاہت کی رسیاں کھولیں اور دھرم کے کہنے پر اسے ہوش میں لانے لگی۔ پدمنی کا شوہر شنکر کمرے کے دروازے سے یہ سب دیکھ رہا تھا اور اپنی بیوی کی یہ حالت دیکھ کر زیر لب مسکرا رہا تھا۔

☆======☆======☆

جب مجھے ہوش آیا تو دھرم سنگھ کو دیکھ کر مجھے حیرت کا دھچکا لگا۔ دائیں طرف پدمنی کا بھائی رام داس مرا پڑا تھا۔ پدمنی کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے تھے اور اس کے منہ میں کپڑا

ٹھونسا ہوا تھا۔ پدمنی کا شوہر شنکر میرے سر پر لگی چوٹ پر پٹی باندھ رہا تھا جب کہ دھرم سنگھ مونچھوں کو تاؤ دے رہا تھا۔ میں ساری صورت حال سمجھ چکا تھا مگر دھرم یہاں کیسے پہنچا۔ یہ سمجھ سے باہر لگ رہا تھا۔

اس سے پہلے کہ میں کچھ پوچھتا۔ دھرم خود ہی بول اٹھا۔ ''صاحب جی۔ شکر ہے گرو دا کہ تسی سلامت ہو' پر صاحب جی! رانی کو ان ظالماں نے پہاڑی والے مندر میں قید کر دیتا اے۔'' میں اس کی بات سن کر پریشان ہو گیا۔

رام داس نے بھی یہی کہا تھا اور اب مجھے ہر حال میں پہاڑی والے مندر سے رانی کو بچا کر نکلنا تھا۔ مگر صبح کی کرنیں پھوٹنا شروع ہو گئی تھیں اور گاؤں والے کچھ دیر میں گھروں سے کام کاج کے لیے نکلنے والے تھے۔

میں نے شنکر کو تشکر بھری نگاہوں سے دیکھا اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ''شنکر! کیا ممکن ہے کہ تم آج دن بھر ہمیں اپنے گھر میں چھپائے رکھو مگر اس کی خبر باہر کسی کو نہ ہو ورنہ ہمارے ساتھ تمہاری جان کو بھی خطرہ ہو سکتا ہے۔''

شنکر اگرچہ ذرا سہما ہوا تھا۔ میری بات سن کر اس نے پدمنی کی طرف ڈرتے ڈرتے دیکھا جو یہ سب سن کر اسے گھورے جا رہی تھی۔

میں نے صورتِ حال کا اندازہ لگا لیا اور دھرم سنگھ کو اشارہ کیا۔ دھرم نے کرپان نکالی اور پدمنی کے بالوں کو کھینچتے ہوئے کرپان اس کی شہ رگ پر رکھ دی۔ پدمنی کی آنکھیں خوف سے ابل پڑیں۔ میں نے پدمنی کو گھورتے ہوئے کہا۔ ''کیوں تمہیں کوئی اعتراض ہے۔ ہمارے یہاں ٹھہرنے پر؟''

وہ بھلا کیا کہتی۔ ڈر کے مارے اس نے سر جھکا لیا۔ شنکر کو اپنی بیوی کی اتنی بری حالت پر ترس آ گیا اور وہ ہاتھ جوڑ کر مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''صاحب! آپ جب تک مرضی ٹھہرو پر میری گھر والی کو نہ مارو۔ یہ کوئی بھی ایسی ویسی حرکت نہیں کرے گی۔''

میں سمجھ گیا کہ اب شنکر بغیر کسی ڈر کے ہماری مدد کرے گا۔ اس لیے میں نے دھرم سنگھ کو پیچھے ہٹنے کا اشارہ کیا۔ شنکر کو پدمنی کے پاؤں کھولنے کو کہا تاکہ اسے سامنے کے کمرے میں بند کر دیا جائے۔

اب اصل مسئلہ رام داس کی لاش کو تب تک چھپانا تھا جب تک ہم وہاں سے نکل نہ

جاتے۔ میں نے دھرم اور شنکر سے لاش اندر کے کمرے میں لے جانے کو کہا۔ انہوں نے کچھ ہی دیر میں لاش اندر کمرے میں چارپائی کے نیچے چھپا دی۔ ہر طرف سے مطمئن ہو کر میں نے شنکر کو ہر طرح کے خطرے سے چوکنا رہنے کی تلقین کی۔ دن نکل چکا تھا اور باہر لوگوں کی چہل پہل کی آوازیں آنا شروع ہو گئی تھیں۔

دھرم سنگھ اب تک مجھے مختصراً اپنے یہاں تک پہنچ جانے کی کہانی سنا چکا تھا اور میں خداوند کریم کا بے حد شکر گزار تھا کہ اس نے بروقت دھرم کے موٹے دماغ میں یہ بات ڈال دی کہ میں اور رانی خطرے میں گھر چکے تھے اور آج اگر دھرم نہ پہنچتا تو رام داس اور پدمنی نہ جانے میرے ساتھ کیا کر گزرتے۔ میں نے بھی اسے مختصراً اپنے اور رانی کے ساتھ پیش آنے والے واقعات کے بارے میں بتایا۔ یہ سب واقعات سن کر اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے مگر میں نے اسے تسلی کہ اب چونکہ میرے پاس کراماتی انگوٹھی موجود ہے اس لیے میں ہر قسم کے شیطانی عوامل سے محفوظ ہوں۔ دھرم چونکہ مجھے اور رانی کو رات کے اندھیرے میں تارا پور لایا تھا اس لیے گاؤں کے کسی بھی آدمی کو اس پر یہ شک نہیں گزر رہا تھا کہ اس کا مجھ سے یا رانی سے کوئی تعلق تھا۔ میں نے اسے احتیاط سے باہر نکل جانے کو کہا اور ہدایت دی کہ رات ہوتے ہی وہ اپنی گاڑی کسی قریبی جگہ پر لے آئے میں شنکر کی مدد سے آج کی رات پہاڑی والے مندر میں پہنچ کر رانی کو چھڑا کر لے آؤں گا۔

اس نے میری ہدایات پر سر ہلایا اور دھیرے سے باہر نکل گیا۔ اتنی دیر میں شنکر باجرے کی روٹی اور مکھن کا ناشتا بنا لایا۔ مجھے بے حد بھوک لگ رہی تھی۔ میں نے یہی کھانا غنیمت جانا اور اس پر ٹوٹ پڑا۔ پیٹ بھرتے ہی مجھ پر نیند کا غلبہ ہونے لگا۔ میں نے شنکر کو ایک بار پھر بلا کر ہدایات دیں اور اس سے کہا کہ وہ کسی بھی خطرے کو محسوس کرتے ہی مجھے ہر حال میں آگاہ کرے اور پدمنی کو تب تک بندھا رکھے جب تک میں وہاں سے نکل نہ جاؤں۔ میرے کہنے پر اس نے پدمنی کو ناشتا دیا اور ناشتے کے بعد پھر سے اس کے منہ پر کپڑا ٹھونس دیا کہ کہیں وہ شور مچا کر آس پاس کے گھر والوں کو اپنی طرف متوجہ نہ کر لے۔

اب ہر طرف سے مطمئن ہو کر میں اسی کمرے میں جا کر لیٹ گیا۔ جہاں میں اور رانی پچھلی رات کو ٹھہرے تھے۔ لیٹتے ہی مجھے رانی کا خیال آ گیا۔ نہ جانے وہ بے چاری کس حال میں ہو گی؟ میں نے اپنے آپ سے پوچھا مگر میں مطمئن تھا کہ شیام پجاری اسے اس

وقت تک زندہ رکھے گا جب تک وہ مجھے ڈھونڈ نہ نکالے اور اسے یہ بھی یقین ہو گا کہ میں رانی کو لینے کی خاطر مندر ضرور پہنچوں گا۔ اسی لیے مجھے خطرہ تھا کہ پہاڑی والے مندر میں داخلہ بہت خطرناک ہو گا اور مجھے رانی اتنی آسانی سے نہیں ملے گی۔ یہ سوچتے سوچتے میری آنکھ لگ گئی۔ میں نے خواب میں اپنے بزرگوں کو دیکھا۔ وہ سب مطمئن نگاہوں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔

پھر مجھے میرے والد مرحوم نظر آئے۔ وہ مجھے نصیحت کر رہے تھے۔ ''وجاہت بیٹا! تم نے میرے ذمے کا فرض ادا کر دیا لیکن اپنے ذمے کے فرائض ضرور ادا کر دینا۔ تمہارے پاس ہمارے پیروں کی عطا کی ہوئی کراماتی انگوٹھی آ چکی ہے۔ چالیس دن تک تم اس انگوٹھی کی حفاظت کرنا۔ اسے اپنے آپ سے دور مت کرنا اور پھر یہ تمہاری سات نسلوں کو ان شیطانی بلاؤں سے محفوظ رکھے گی۔'' یہ کہہ کر وہ نظروں سے اوجھل ہو گئے اور میری آنکھ کھل گئی۔

میں نے کمرے سے باہر جھانکا تو شنکر کو موجود پایا۔ دوپہر کا وقت ہو چکا تھا کیوں کہ گھر کے صحن میں خوب دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔

اچانک باہر دروازے پر زور زور سے دستک ہوئی تو میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ شنکر بھی پریشانی کے عالم میں اٹھ کھڑا ہوا اور میرے کمرے کی طرف بھاگ کر آیا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا' میں نے اس سے کہا۔ ''فکر کی کوئی بات نہیں' تم جاؤ اور گھبرائے بغیر صورت حال کو سنبھالنے کی کوشش کرو۔''

وہ الٹے قدموں دروازے کی طرف بھاگا کیوں کہ دوبارہ دستک ہوئی تھی۔ میں نے کمرے کا دروازہ بند کر لیا اور کمرے میں موجود کھڑکی کے شیشے سے باہر کی صورت حال کا جائزہ لینے لگا۔ شنکر کا دیا ہوا خنجر میرے ہاتھ میں تھا اور میں کسی بھی ناگہانی صورت حال سے نپٹنے کے لیے تیار تھا۔ کچھ دیر تک باہر سے زور زور سے بولنے کی آوازیں آتی رہیں جیسے کوئی پوچھ گچھ کر رہا ہو۔ میں سانس روکے گفتگو سننے کی کوشش کرتا رہا مگر میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ میرے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیاں پسینے سے شرابور تھیں۔

کچھ دیر کے بعد شنکر اندر داخل ہوا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑتے دیکھ کر میرے

اوسان خطا ہو گئے۔ اس نے دروازے کو اندر سے بند کیا اور تقریباً بھاگتا ہوا میرے کمرے کی طرف آیا۔ میرے پوچھنے سے پہلے ہی وہ سانس لیے بغیر بولا۔ ''رام داس کے محلے والے کچھ پجاری اس کا پتا کرنے آئے تھے۔ میں نے ان سے کہہ دیا کہ شنکر اور پدمنی دونوں صبح سویرے ساتھ والے گاؤں کسی کام سے چلے گئے۔ یہ سن کر وہ مطمئن تو نہیں ہوئے لیکن واپس چلے گئے' کہہ رہے تھے کہ شام کو دوبارہ آئیں گے۔''

یہ سن کر میں نے سکون کا سانس لیا اور چارپائی پر ڈھیر ہو گیا۔ اچانک مجھے پدمنی کا خیال آیا تو میں نے ہڑبڑا کر شنکر سے اس کے بارے میں پوچھا۔ شنکر نے بتایا کہ وہ اسی حالت میں ساتھ والے کمرے میں سو رہی ہے میں یہ سن کر مطمئن ہو گیا اور شام ہونے کا انتظار کرنے لگا۔

☆======☆======☆

پہاڑی والے مندر میں کہرام مچا ہوا تھا۔ شیام پجاری وحشیوں کی طرح چیخ رہا تھا۔ اس کے ہاتھوں کی مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں اور شدید غصے کی حالت میں اس کے منہ سے کف جاری تھا۔ وہ بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ مندر کے باقی پجاری سہمے ہوئے کھڑے تھے کیوں کہ انہوں نے بڑے پجاری شیام کو اس قدر غصے کی حالت میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ انہیں اس کے غصے کی وجہ بھی معلوم تھی اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ رات ڈھلنے سے پہلے اگر اس مسلمان لڑکے کو کالی دیوی کے چرنوں میں بھینٹ نہ چڑھایا گیا تو دیوی کا قہر ان پر ٹوٹ پڑے گا۔ کس عجیب دھرم کے پجاری تھے وہ جہاں خوف اور وحشت کی فضا ہر وقت چھائی رہتی تھی۔ شیام نے دہاڑتے ہوئے تمام پجاریوں کو حکم دیا کہ شام ڈھلنے تک اس مسلمان لونڈے کو مندر میں لایا جائے۔ یہ سن کر تمام پجاری تیزی سے باہر نکل گئے اور شکاری کتوں کی طرح وجاہت کو آس پاس کے علاقے میں تلاش کرنے لگے۔

☆======☆======☆

شام کا اندھیرا چہار سو پھیل رہا تھا۔ میں نے شنکر کو ساتھ لے کر پہاڑی والے مندر کی طرف جانے کا ارادہ کر لیا تھا مگر پوری طرح سے اندھیرا پھیلنے کا انتظار کر رہا تھا۔ شنکر نے مجھے ایک کپ گرم گرم چائے لا کر دی۔ اب تک ہم دونوں کے درمیان بہت بے تکلفی پیدا ہو چکی تھی اور وہ مجھ سے بہت دوستانہ انداز میں بات چیت کر رہا تھا۔ جب ہر طرف گہرا

اندھیرا اچھل گیا تو ہم پدمنی کو اسی حالت میں کمرے کے اندر بند کر کے چپکے سے باہر نکلے۔ میں نے اپنا حلیہ مقامی لوگوں کی طرح بنا رکھا تھا۔ اس سلسلے میں بھی شنکر ہی نے میری مدد کی۔

ہم تیز قدموں سے آگے پیچھے چلتے ہوئے گاؤں کے مشرقی حصے کی جانب چل پڑے۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ آگے چل کر کیا ہونے والا ہے اور نہ ہی میرے ذہن میں اب تک کوئی پلان تھا جس سے میں رانی کو پہاڑی والے مندر سے چھڑا کر نکل جاتا۔ فقیر بابا کی دی ہوئی تسبیح میرے دائیں ہاتھ میں تھی اور میں اس پر ورد کیے جا رہا تھا۔ جب کہ میرے آباؤ اجداد کی عطا کی ہوئی کراماتی انگوٹھی بھی میرے پاس تھی اور میں ان دونوں چیزوں کی موجودگی میں بہت مطمئن تھا کہ کوئی بھی شیطانی آفت یا عمل میرا بال تک بیکا نہیں کر سکتا۔

مندر کی جانب ہمارا سفر بڑی خاموشی سے جاری تھا۔ اب ہم گاؤں سے باہر آ چکے تھے اور سامنے اندھیرے میں پہاڑی کی چوٹی پر مندر کی روشنیاں مجھے صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ میرے اندازے کے مطابق ہمیں وہاں تک پہنچتے پہنچتے دو گھنٹے لگ سکتے تھے۔ میں دل ہی دل میں دعا کر رہا تھا کہ دھرم سنگھ پہلے سے مقررہ جگہ پر پہنچ جائے تاکہ جب میں رانی کو مندر سے چھڑا کر نکلوں تو ہم بغیر کسی دقت کے تاراپور سے نکل سکیں۔ یہاں سے آگے شنکر کو لے جانا اس بے چارے کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا تھا اس لیے میں نے اسے یہیں سے لوٹ جانے کو کہا۔ وہ بھی آگے جانے سے گھبرا رہا تھا۔ میری اس تجویز پر اس نے جھک کر نمسکار کیا اور الٹے قدموں گاؤں کی جانب بھاگا۔ میں نے خدا کا نام لے کر آگے کا سفر شروع کیا۔

☆======☆======☆

رات کا اندھیرا ہر طرف چھا چکا تھا۔ شیام کے ساتھی پجاری وجاہت کی تلاش میں ناکام لوٹے تھے۔ ان کے خیال کے مطابق وجاہت کھنڈرات میں کہیں روپوش ہو گیا تھا اس لیے وہ دیوی کے منتر پڑھتے ہوئے ان تاریک کھنڈرات میں اسے ڈھونڈتے رہے مگر وجاہت کا کوئی پتا نہ چلا۔ تنگ آ کر انہوں نے گاؤں میں بھی بندے دوڑائے مگر بے فائدہ۔ حیرت کی بات تو یہ تھی کہ ان کا ساتھی پجاری رام داس اور اس کی بہن پدمنی بھی کہیں غائب تھے۔ یہ بات انہیں مزید پریشان کر رہی تھی اور یہ تمام معاملہ ان کی گنجی کھوپڑیوں کی سمجھ سے باہر تھا اس لیے وہ اپنے بڑے پجاری کے پاس ہی لوٹ [illegible] تے

ڈرتے اپنی ناکام تلاش کے بارے میں بتایا۔

شیام جو پہلے ہی آگ بگولہ تھا۔ یہ سب سن کر آپے سے باہر ہو گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے اور مہا پجاری بھگوشام کو کیا جواب دے۔ بھگوشام مندر کا سب سے پرانا اور انتہائی پُراسرار پجاری تھا اور کالی دیوی کے انتہائی ماننے والوں میں سے ایک تھا۔ وہ مندر کے تہہ خانے میں برسوں سے پوجا میں بیٹھا ہوا تھا اور سوائے شیام کے اور کسی بھی پجاری کو اس سے ملنے کی اجازت نہ تھی۔

شیام جو اب تک آگ بگولہ تھا' جوں جوں بھگوشام کے تہہ خانے کی سیڑھیاں اتر رہا تھا۔ اس کی حالت یکسر تبدیل ہوتی جا رہی تھی۔ جیسے ہی اس نے شام کے اندھیرے کمرے میں قدم رکھا۔ اس پہ کپکپی طاری ہو گئی۔ وہ کمرے میں داخل ہوتے ہی سر جھکا کر مؤدب کھڑا ہو گیا۔

کچھ دیر کی خاموشی کے بعد کمرے کے تاریک کونے سے پھنکارتی ہوئی آواز آئی۔

''مجھے معلوم ہے تم کیوں آئے ہو۔ پر غلطی بھی تمہاری ہے۔ تم سے اتنا نہ ہو سکا کہ اس لونڈے کو انگوٹھی تک پہنچنے سے روک سکتے۔ تمہیں ہم نے اتنی شکتی دی' تم پھر بھی ہار گئے۔''

''مم مم...... مجھے شما کر دیں۔'' شیام کپکپاتے ہوئے بولا۔

''خاموش......'' شام پھنکارا۔

شیام خاموش ہو گیا۔ کمرے میں گہرا سکوت چھا گیا۔ تاریک کونے میں دو خوفناک لال انگارہ آنکھیں اسے گھور رہی تھیں اور شیام کو یوں لگا جیسے اس کی سانس رک گئی ہو۔ پھر اچانک اس کے نتھنوں سے خون نکلنا شروع ہو گیا اور اسے اپنی کنپٹی پہ دباؤ محسوس ہونے لگا۔ وہ سمجھ گیا کہ دیوی بہت ناراض ہے۔

وہ گھٹنوں کے بل گر پڑا اور ہاتھ جوڑ کر گڑگڑانے لگا۔ ''اے دیوی کے رکھوالے بیٹے! مجھے شما کر دے۔ مجھے ایک موقع دے۔ میں اس لونڈے کو بھسم کر دوں گا۔ اسے دیوی کے چرنوں میں کاٹ ڈالوں گا۔ میں دیوی کا پرانا پجاری ہوں۔ مجھے شما کر دو۔'' شیام گڑگڑائے جا رہا تھا اور یہی الفاظ بولے جا رہا تھا۔

تب کونے سے پھر وہی پھنکار سنائی دی۔ ''نہیں اب یہ تیرے بس کی بات نہیں رہی۔ صدیوں سے میں نے ہی ان کا مقابلہ کیا ہے۔ اب اس سلسلے کی آخری کڑی سے بھی

میں ہی نمٹوں گا۔ جا تُو دفع ہو جا اور دیوی کے چرنوں میں بیٹھ کر معافی مانگ۔ وہ تجھ سے ناراض ہے۔ جا دفع ہو جا۔"

شیام الٹے قدموں بھاگا اور بالائی منزل پر پہنچ کر دیوی کے بت کے سامنے ماتھا ٹیک کر گڑگڑانے لگا۔

☆======☆======☆

تقریباً ساڑھے آٹھ سو برس قبل برصغیر کی سرزمین پر کالے علم کے عاملوں کا راج تھا اور ہندومت کے انتہا پسند جو کالی دیوی کے پجاری تھے۔ کالے علم کے ماہر ترین عامل شمار ہوتے تھے۔ کالی ماں کے ان پجاریوں کا ایک طویل سلسلہ تھا جس کا سرکردہ شنکر شام بھگوان تھا۔ کالی دیوی ہندو مذہب میں ڈر اور خوف کی علامت ہے اور یہ لوگ کالی دیوی کے چرنوں میں انسانوں کے سر کاٹ کر نذرانے پیش کرتے اور اپنے علم اور شکتی (طاقت) میں اضافہ کرتے۔ پھر یہ لوگ اپنے شیطانی عملیات میں اس قدر ماہر ہو گئے کہ مافوق الفطرت مخلوقات کو بھی قابو کرنے لگے۔ یوں ان کا راج بڑھتا گیا۔ ان شیطانی شکتیوں کو ان لوگوں نے برصغیر کے مسلمانوں کے خلاف استعمال کرنا شروع کر دیا جو دین اسلام کی اشاعت میں مگن تھے اور برصغیر کی سرزمین پر تب تک معتبر اکابر دین قدم رنجہ فرما چکے تھے۔ ان اولیاء کرام کی بدولت ہندومت کے ہزاروں لاکھوں ماننے والے دن رات اسلام کی روشنی سے منور ہوتے جا رہے تھے اور یہ بات ہندومت کے پجاریوں میں خطرے کا الارم بن چکی تھی۔ تب اس شیطانی گروہ نے مسلمانوں کو اپنے شیطانی عوامل سے زچ کرنا شروع کیا مگر اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ان شیدائیوں کے خلاف ان کا کوئی حربہ کامیاب نہ ہو سکا۔

اولیا کرام نے عبادت' اذکار الٰہی' مجاہدوں اور نفس کشی کی بدولت وہ معجزات پا لیے تھے کہ ان شیطانی قوتوں کا منہ توڑ جواب دے سکیں۔ حق و باطل کے ان معرکوں میں شیطانی عوامل کے پیروکاروں کو ہمیشہ شکست سے دوچار ہونا پڑا۔

مسلم اکابرین نے شیطانی قوتوں کے خلاف جہاد جاری رکھا اور یہ جہاد پشت در پشت جاری رہا۔ اسی طرح کالی دیوی کے شیطان پجاریوں کے حربے بھی نسل در نسل مسلمانوں کے خلاف جاری رہے۔ شیطان کے ان پیروکاروں کے سرکردہ شنکر شام بھگوان نے اپنے اکلوتے سپوت بھوشام کو مرنے سے پہلے اپنی ساری شکتیاں دے دیں۔ ان

شیطانی شکتیوں میں سب سے مہان شکتی (بڑی طاقت) یہ تھی کہ بھوشام انسانی خون پی کر اپنے آپ کو امر رکھ سکتا تھا اور یہی وجہ تھی کہ صدیاں بیت جانے کے بعد بھی بھوشام اب تک زندہ تھا۔ مگر اس کی ساری شکتیاں تب تک مؤثر تھیں جب تک رات کا اندھیرا طاری رہتا۔ دن کی روشنی میں اگر وہ نکلتا تو جل کر راکھ ہو جاتا۔ اسی لیے کئی صدیوں سے وہ اندھیروں میں رہ رہا تھا۔ کسی نے بھی آج تک اس کی صورت نہ دیکھی تھی۔ وہ انسان نما شیطانی مخلوق تھی جو رات کی تاریکیوں میں بے مہار ہو کر نکلتا' کسی شیر خوار کا خون پی کر وہ مزید جینے کی شکتی پاتا مگر دن کی روشنی میں نکلنے کی شکتی اسے تب ہی ملتی جب وہ اپنے دھرم کے سب سے بڑے دشمن کے شیر خواروں کا خون پی لیتا۔

اس شیطانی گروہ کے دشمن معتبر بزرگ دین کرامت علی خان تھے۔ جنہوں نے ان شیطانوں کے خلاف بھرپور جہاد کر کے ان کا قلع قمع کیا اور اپنے علم و فراست' عبادات اور صوفیانہ عوامل سے اپنی سات نسلوں کو بھی ان شیطانوں کے حربوں سے محفوظ کر لیا اور اپنے وقت کے ولی اللہ سے ایک ایسی کراماتی انگوٹھی حاصل کرنے کا شرف حاصل کیا جو نسل در نسل ان کے خاندان کو کالی دیوی کے پیروکاروں کے حربوں سے محفوظ رکھ سکتی اور نواب وجاہت علی خان ان کی ساتویں پشت کا واحد سپوت تھا جس نے وہ کراماتی انگوٹھی پہن لی تھی مگر طریقے کے مطابق اسے چالیس دن تک انگوٹھی پہن کر رکھنی تھی۔ تب اس کی اگلی نسل بھی محفوظ رہ پاتی۔

بھوشام نے صدیوں سے اس دن کا انتظار کیا تھا کہ کب وجاہت باپ بنے اور وہ اس کے شیر خوار بچے کا گرم گرم خون پی کر ہمیشہ کے لیے امر ہو جائے۔ اسی لیے اس نے شیطانی قوتوں سے وجاہت کو انگوٹھی سے دور رکھنے کی کوشش کی مگر اس کے پیروکاروں کی غفلت سے وہ انگوٹھی تک پہنچ گیا مگر وہ کسی بھی حال میں وجاہت کو چالیس دن تک انگوٹھی پہننے سے روکے رکھنا چاہتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ وجاہت کا زیادہ کچھ بگاڑ نہیں سکتا تھا مگر اتنی صدیوں کے انتظار کے بعد اسے اپنے مقصد میں ناکامی ہوتی' یہ اسے منظور نہ تھا۔ رعت کا اندھیرا چار سو چھا چکا تھا۔ اس نے اپنی تخیل کی آنکھ سے وجاہت کو مندر کے قریب آتا دیکھ لیا تھا وہ اٹھا اور بھاگتا ہوا دیواروں میں سے گزر گیا۔ اب وہ مندر کے باہر پہنچ گیا تھا۔

☆======☆======☆

میں مندر کے قریب پہنچتے پہنچتے بے انتہا تھک چکا تھا۔ دو گھنٹے کی پُر مشقت چڑھائی چڑھنے کے بعد میں پسینے میں بری طرح شرابور ہو چکا تھا۔ میں نے اس لیے فیصلہ کیا کہ کچھ دیر سستا لوں۔ میں قریب ہی ایک بڑے سے پہاڑی پتھر سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ رات بالکل تاریک تھی۔ آسمان پر بادلوں کی وجہ سے تارے بھی غائب تھے۔ میں نے فقیر بابا کی دی ہوئی تسبیح نکالی اور ذکر کرنے لگا۔ اچانک مجھے مندر کی دیوار کے پاس کسی کے چلنے کی آواز سنائی دی۔ میں سنبھل کر بیٹھ گیا اور کان آواز کی جانب لگا دیے۔

کوئی بہت سنبھل کر چل رہا تھا۔ میں فوراً پتھر کی اوٹ میں چھپ گیا اور دیکھنے لگا کہ کون ہے۔ کچھ دیر بعد ایک سایہ دکھائی دیا۔ سائے کو دیکھ کر مجھے یہ اندازہ ہوا کہ وہ کوئی عورت تھی جو چھپ چھپ کر اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے میری جانب ہی بڑھی چلی آ رہی تھی۔ اسے کیسے معلوم ہوا کہ میں یہاں چھپا ہوا ہوں؟ میں نے اپنے آپ سے پوچھا۔ مگر اس کے انداز سے ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے وہ کسی سے چھپ کر بھاگ رہی ہو۔ کیوں کہ وہ بار بار مڑ کر مندر کی جانب دیکھ رہی تھی۔

اچانک مندر سے کئی لوگوں کے باہر آنے کی آوازیں سنائی دیں اور کچھ پجاری ہاتھوں میں مشعل اٹھائے دکھائی دیے۔ وہ یقیناً اس لڑکی کو ڈھونڈ رہے تھے۔ کیوں کہ ان کے نکلتے ہی وہ لڑکی بھاگتی گرتی کسی آڑ کو ڈھونڈنے لگی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ لڑکی یقیناً ان شیطان پجاریوں کے چنگل سے نکل کر بھاگ رہی ہے۔

میں نے اس لڑکی کی مدد کا تہیہ کر لیا۔ اس سے پہلے کہ کوئی لڑکی کو دیکھ پاتا۔ میں بجلی کی سی تیزی سے اٹھا اور لپک کر اسے ہاتھ سے کھینچتا ہوا پتھر کی اوٹ میں لے آیا۔ اس کے منہ سے چیخ نکلنے سے پہلے ہی میرا ہاتھ اس کے منہ پر تھا۔ وہ ڈر گئی تھی' اس کی آنکھیں خوف کے مارے باہر نکل آئی تھیں مگر میں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے چھپے رہنے کا اشارہ کیا اور اپنا ہاتھ اس کے منہ سے ہٹا لیا۔ اس نے گہری گہری سانسیں لیں اور حیرت سے مجھے دیکھنے لگی۔

میں پتھر کی اوٹ سے پجاریوں کو دیکھنے لگا۔ وہ اِدھر اُدھر دیکھ کر بات چیت کرنے لگے۔ پھر وہ سب بھاگتے ہوئے مخالف سمت کی طرف بڑھ گئے۔ میں نے سکون کا سانس لیا اور لڑکی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ آخر وہ کون تھی اور اس مندر تک کیسے پہنچی؟ میں یہ اس سے

معلوم کرنا چاہ رہا تھا مگر یہ کیا۔ وہ تو بے ہوش ہو چکی تھی۔ میں اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا۔

کچھ دیر بعد اس نے آنکھیں کھولیں اور مجھے دیکھ کر بولی۔ ''تم کون ہو؟''

میں اس کا سوال سن کر ہنس دیا اور بولا۔ ''یہی تو میں بھی تم سے پوچھنا چاہ رہا تھا کہ تم کون ہو اور یہاں کیا کر رہی ہو؟''

میری بات سن کر اس نے ٹھنڈی آہ لی اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔ پھر کچھ دیر وہ مجھے دیکھتی رہی۔ اندھیرے کے باوجود مجھے یہ اندازہ لگانے میں مشکل نہ ہوئی کہ وہ ایک جوان لڑکی تھی۔ جس کے لباس اور انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ ہندو تھی۔ کچھ دیر خاموشی کے بعد وہ گویا ہوئی۔ ''میرا نام رادھیکا ہے۔ میں قریبی گاؤں میں رہتی ہوں۔ میرے پتا تو عرصہ ہوا مر چکے' پر ایک اندھی ماں اور چھوٹا بھائی جیتن میرے ساتھ رہتے ہیں۔ گھر کا خرچہ پانی میں ہی کسی نہ کسی طرح چلاتی ہوں۔ ایک دن میں گاؤں کے مندر میں پوجا کے لیے گئی تو وہاں پر پجاری جی کو میں پسند آ گئی۔ وہ مجھے اس پہاڑی والے مندر کے بڑے پجاری کے پاس دھوکے سے لے آیا اور یہاں کے پجاری شیام نے مجھے اپنے آشرم میں قید کر لیا۔ کئی دنوں سے میں یہاں قید تھی۔ یہ بڑے ظالم لوگ ہیں۔ میں نے ان کے بڑے ہاتھ جوڑے کہ میری اندھی ماں اور چھوٹا بھائی میرے بغیر بھوکے مر جائیں گے مگر انہیں مجھ پر ذرا بھی رحم نہ آیا۔ پھر آج رات میں مندر کے چور راستے سے بھاگ نکلی۔ مگر انہیں میرے نکلنے کی خبر ہو گئی۔ اس لیے وہ اب میرا پیچھا کر رہے ہیں۔ بھگوان کے لیے مجھے یہاں سے لے چلو ورنہ ان لوگوں کے ہاتھ چڑھ گئی تو یہ مجھے کاٹ ڈالیں گے۔''

میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''فکر مت کرو' میں بھی ان لوگوں سے لڑنے آیا ہوں۔ میری بھی ایک ہمدرد ان لوگوں کی قید میں ہے۔ اسے بھی اسی مندر نما قید خانے سے نکالنا ہے۔''

یہ سن کر وہ فوراً بولی۔ ''کیا تم اس سکھ لڑکی رانی کی بات کر رہے ہو جسے یہ لوگ کالے علم کے زور پر اڑا کر لائے تھے؟''

میں نے کہا۔ ''ہاں ہاں! کیا تم بتا سکتی ہو کہ وہ اس مندر کے کس حصے میں قید ہے؟''

اس پر وہ لڑکی بولی۔ ''ہاں! وہ مندر کی بالائی منزل پر ایک ستون کے ساتھ بندھی

ہوئی ہے مگر وہاں تک پہنچنا بہت مشکل ہے کیوں کہ مندر میں ہر طرف پجاری دندناتے پھرتے ہیں۔ پھر ان لوگوں کے پاس بڑی شکتیاں ہیں۔ یہ عام لوگوں کو اپنے جادو منتر سے قابو کر لیتے ہیں۔“

میں نے طنزاً کہا۔ ”تم اس کی فکر مت کرو۔ یہ بتاؤ کہ چور دروازہ کس طرف ہے تا کہ میں مندر کے اندر داخل ہو سکوں۔“

رادھیکا بولی۔ ”چور دروازے سے اندر جانے کا بہترین وقت صبح سویرے کا ہے کیوں کہ سورج نکلنے کے وقت سب پجاری مندر کی چھت پر بیٹھ کر گیان دھیان کرتے ہیں۔ اس وقت صرف سامنے کے دروازے پر پہرے دار ہوتے ہیں۔ پچھلا دروازہ بالکل خالی ہوتا ہے۔ وہ تو میری خوش قسمتی ہے کہ میں چور دروازے کے پہرے داروں کو دھوکہ دے کر باہر نکل آئی۔“

مجھے اس کی باتوں پر یقین آ گیا۔ میں نے اس سے پُرعزم ہو کر کہا۔ ”دیکھو، اگر تم جانا چاہو تو اپنے طور پر نکل سکتی ہو مگر میں تو ہر حال میں رانی کو لے کر جاؤں گا اور اگر صبح تک رکنا چاہو تو رک جاؤ۔ میں رانی کو لے آؤں تب تک تم یہیں آس پاس چھپی رہو پھر ہم ساتھ ہی یہاں سے نکل چلیں گے۔“

اس نے کچھ دیر سوچ کر ہامی بھر لی اور میرے قریب ہی بیٹھ کر پتھر سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں۔ پھر آنکھیں کھول کر اس نے مجھ سے پوچھا۔ ”پر تم نے نہیں بتایا کہ تم کون ہو اور کہاں سے آئے ہو؟ بات چیت سے تو پردیسی لگتے ہو۔“

اس پر میں نے مختصراً اسے اپنی کہانی سنا دی مگر انگوٹھی وغیرہ کا ذکر نہیں کیا تا کہ کہیں وہ ڈر کر کوئی ایسی حرکت نہ کرے جس سے میرا سارا پروگرام چوپٹ ہو جائے۔ میری کہانی سن کر اسے مجھ سے ہمدردی ہوگئی اور اس نے وعدہ کیا کہ وہ میری ہر ممکن مدد کرے گی اور صبح تک رک کر مجھے چور دروازے تک لے کر جائے گی۔

میں پُرسکون ہو گیا اور صبح کا انتظار کرنے لگا۔ پجاری جو رادھیکا کو تلاش کر رہے تھے، شاید کہیں دور نکل گئے تھے۔ اس لیے ان کی آوازیں بہت دیر سے سنائی نہیں دے رہی تھیں۔

رادھیکا بھی پتھر سے ٹیک لگائے آنکھیں بند کر کے لمبے لمبے سانس لے رہی تھی۔ پھر

وہ اٹھی اور اپنے پہلو سے بندھی پوٹلی کھولنے لگی۔ میں حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔ اس نے کسی کاغذ میں لپٹی ہوئی کھانے کی کوئی چیز نکالی اور کھانے لگی۔ اسے کھاتا دیکھ کر میری بھوک بھی چمک اٹھی۔ میں نے شام ہونے کے بعد سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ میری حالت دیکھ کر اس نے کھانا میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے پھر بھی تکلف دکھاتے ہوئے پوچھا۔ ”یہ کیا ہے؟“

وہ چہک کر بولی۔ ”مندر سے نکلتے ہوئے پجاری کے کمرے میں کھانا پڑا ہوا تھا۔ میں اس میں سے بھنی ہوئی خشک دال اٹھا لائی۔“ یہ کہتے ہی اس نے دوبارہ کھانے والا ہاتھ میری طرف بڑھایا تو میں نے بھی بغیر کسی تردد کے دال کے بھنے دانے منہ میں ڈال کر چبانا شروع کر دیے۔ واقعی دال بہت لذیذ دال تھی یا شاید مجھے بھوک بہت لگی ہوئی تھی۔ خیر میں نے یکے بعد دیگرے دال کے دانے منہ میں ڈالنا شروع کیے۔ تب تک انہیں چن چن کر کھاتا رہا جب تک وہ ختم نہ ہو گئے۔ کھانا کھا کر مجھے توانائی کا احساس ہوا اور میں نے رادھیکا کا شکریہ ادا کیا اور پتھر سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اب مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ میں نے آنکھیں کھول کر اپنے اردگرد دیکھا تو گہری خاموشی تھی اور رادھیکا بھی آنکھیں موندے بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی آنکھیں موند لیں اور پھر میں نیند کی گہری وادیوں میں چلا گیا تھا۔

☆======☆======☆

رادھیکا نے وجاہت کو کھانے میں بے ہوشی کی دوا دے دی تھی۔ وہ کچھ دیر خاموش پڑی اسے تکتی رہی۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔ جب اسے تسلی ہوگئی کہ وجاہت مکمل طور پر بے ہوش ہو چکا ہے تو وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور پھر اس کا جسم بدلنے لگا اور کچھ لمحوں بعد وہاں رادھیکا کا جسم بھگوان شام کی جسامت میں تبدیل ہو چکا تھا۔ اس کی لال انگارہ خوف ناک آنکھیں کسی وحشی بھیڑیے کی طرح چمک رہی تھیں۔ اس نے وجاہت کو نفرت بھری نظروں سے دیکھا اور پھر اس کی نظریں وجاہت کی انگلی میں پڑی ہوئی کراماتی انگوٹھی پر جم گئیں۔

☆======☆======☆

رادھیکا نے خوفزدہ نظروں سے ان پجاریوں کو دیکھا جو مشعلوں کی روشنی میں اسے ڈھونڈتے ہوئے اسی طرف بڑھ رہے تھے۔ شاید اسی لیے وہ مہر بہ لب تھی۔

میں نے اسے خاموش دیکھ کر پوچھا۔ ''بولتی کیوں نہیں ہو' جلدی بتاؤ اسے کہاں رکھا گیا ہے؟''

''اس سکھ لڑکی کو انہوں نے......'' ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ پجاریوں میں سے کوئی چیخا۔

''ادھر......ادھر چھپی ہے۔ میں......نے......میں نے اس کی آواز سنی ہے۔''

پجاریوں کے خوف سے وہ خاموش ہوگئی۔ شاید وہ بہت زیادہ خوف زدہ تھی۔ اگر اجالا ہوتا تو یقیناً میں دیکھ لیتا کہ اس کے چہرے کی رنگت سفید پڑ گئی ہے کیوں کہ اس کا بدن بید مجنوں کی طرح کانپ رہا تھا۔ وہ تپ لرزہ کی مریضہ لگ رہی تھی۔

میں نے جھک کر اس کے کان میں سرگوشی کی:

''تم خود کو سنبھالو۔ ان سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ میں سب کو ان کی اوقات بتا دوں گا۔'' کراماتی تسبیح اور انگوٹھی کی موجودگی نے میرا اعتماد بہت زیادہ بڑھا دیا تھا۔ حالانکہ اس سے قبل میں خود بھی اسی کی طرح خوف زدہ تھا۔

''وہ سب بہت ظالم ہیں۔ ان سے بچنا بہت مشکل ہے۔ اگر میں پکڑی گئی تو وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔'' وہ بھی سرگوشی میں بولی۔

''بس تم دیکھتی رہو۔'' یہ کہہ کر میں پوری طرح تیار ہوگیا۔ میرے ہاتھوں میں کراماتی تسبیح تھی اور انگلی میں انگوٹھی۔ یہی دونوں میرے ہتھیار تھے۔ مجھے پورا یقین تھا کہ میں اپنے اللہ کے سہارے اپنے دشمنوں پر فتح پالوں گا۔ باطل کب حق کے سامنے ٹک پایا ہے۔ لاکھوں سال سے جب سے یہ دنیا خلق ہوئی ہے' شیطان اپنی چالیں چل رہا ہے اور ہر بار اللہ پر بھروسا کرنے والوں سے شکست کھا رہا ہے۔ میں کوئی 'ولی' قلندر یا اولیا نہیں ہوں پھر بھی خدا پر بھروسا کرنے والا ہوں اسی لیے مجھے ان لوگوں سے خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ میں نے تسبیح کو بلند کر کے اپنے آگے کیا اور اس مخصوص دعا کو پڑھنے لگا جس کی ہدایت فقیر بابا نے کی تھی۔ انھوں نے ہی بتایا تھا کہ اس دعا میں اسم اعظم ہے۔ اسم اعظم کیا ہے، اس راز سے خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پردہ نہیں اٹھایا تو پھر فقیر بابا کیسے بتا دیتے کہ اس دعا میں اسم اعظم کہاں مخفی ہے' پھر بھی اس دعا کی تاثیر میں نے کئی بار دیکھی تھی۔ کئی بار موت کے گھیرے سے نکلا تھا۔ شیام جیسے خبیث انسان کے منتر کا توڑ اسی دعا سے کیا تھا اسی لیے میں

نے اس بار بھی اسی دعا کا سہارا لیا تھا۔

ابھی میں نے دعا ختم بھی نہیں کی تھی کہ پجاریوں میں سے کسی نے چیخ کر کہا۔

''شا بھدان! یہاں کوئی اور بھی گپت ہے۔ کوئی دُوشٹ آتما' کوئی سادھک......نہیں نہیں کوئی گمبھیر سمسیا ہے سب مل کر کالی ماتا کا آہوان کرو۔ اسے پکارو' ماں کی مدد درکار ہے۔''

(ہوشیار! یہاں کوئی اور بھی چھپا ہوا ہے۔ شرارتی روح' کوئی عامل......نہیں نہیں کوئی مسئلہ ہے سب مل کر کالی دیوی کو بلاؤ اسے پکارو دیوی کی مدد درکار ہے۔)

''وہ......وہ رہا' اس پتھر کے پیچھے میں نے کسی کو دیکھا ہے۔'' اس نے اشارہ کیا اور وہ سب دوڑ پڑے۔ وہاں پر کوئی اور ایسی جگہ بھی نہیں تھی جہاں میں چھپ سکتا اس لیے میں کھڑا ہوگیا۔

''بولو کیا چاہتے ہو؟'' میں بے خوف ہو کر پتھر کی اوٹ سے نکل آیا اور سینہ پھلا کر کہا۔

''تم کون ہو؟ ہمارے مندر کو اپوتر (ناپاک) کرنے کیوں آئے ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''تمہارے مندر سے مجھے کچھ لینا دینا نہیں ہے۔ میں ادھر بھٹک کر آ گیا ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

''سمجھ گیا تم وہی دُشٹ (شرارتی) ہو جس کے بارے میں ہر طرف ہاہا کار (شور) ہے۔ شیام جی مہارج کے تمام داس (غلام) تمہیں کھوج رہے ہیں۔ میں تمہاری ہتیا (قتل) کر کے شیام جی مہاراج کا سیوک (غلام) بنوں گا۔''

''مجھے ختم کیسے کرو گے؟''

''ایسے جیسے کیا جاتا ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے پھونک ماری۔

مجھے ایسا لگا جیسے میرے تن بدن میں آگ سی بھر گئی ہو پتا نہیں اس نے مجھ پر کون سا عمل کیا تھا میں خود کو سخت اذیت میں محسوس کر رہا تھا۔ مجبوراً میں نے گھبرا کر ورد شروع کر دیا جس کا نتیجہ بھی سامنے آ گیا۔ میری رگوں میں دوڑنے والی بے چینی ختم ہوگئی۔

''بس تیرے اندر اتنی سی قوت تھی۔ اب دیکھ میں کیا کرتا ہوں۔'' یہ کہہ کر میں نے ان کی طرف تسبیح کو اٹھا کر جھٹکا دیا۔

یہ میری دعا کی تاثیر تھی یا اس تسبیح کی کرامت کہ وہ سب اپنی جگہ اس طرح جم کر

کھڑے ہو گئے جیسے برف باری میں منجمد ہو گئے ہوں لیکن یہ وقفہ طویل ثابت نہ ہوا اور وہ فوراً ہوش میں آ گئے‘ شاید انہوں نے توڑ کر لیا تھا۔ زخمی سانپ زیادہ خطرناک ہوتے ہیں۔ وہ بھی خطرے کی علامت بن گئے۔ ان میں جو سب سے آگے تھا‘ لگتا تھا وہ سب سے زیادہ قابل ہے۔ اس نے جھک کر مٹھی میں ریت اٹھائی اور کچھ پڑھ کر میری جانب اچھال دی۔ ریت کے ذرّات میرے جسم سے ٹکرائے اور مجھے ایسا لگا جیسے میرے جسم سے شعاعیں سی نکلیں اور ان ذرات کو جلاتی چلی گئیں۔ میرا یہ کمال انہوں نے بھی دیکھا تھا۔ شاید انہیں حیرت بھی ہوئی تھی لیکن وہ جلد سنبھل گئے تھے۔ سامنے کھڑے شخص نے کہا تھا۔ ”بس اتنے سے شعبدے معلوم ہیں‘ اب میرا یہ وار روک سکتے ہو تو روک لو۔“ کہہ کر اس نے آسمان کی طرف منہ اٹھا کر کچھ پڑھا پھر پھونک ماری۔

پھونک مارتے ہی میں اچنبھے میں پڑ گیا۔ شمال کی جانب سے آسمان پر اڑتی ہوئی ایک ہنڈیا نظر آئی۔ اس ہنڈیا میں آگ سلگ رہی تھی۔ میں جان گیا تھا کہ یہ اس کا آخری حربہ ہے۔ اس قسم کی ہنڈیا کو ”موٹھ“ کہتے ہیں جو دشمن کا تعاقب کر کے اسے جلا کر مار دیتی ہے۔ میں نے اسم اعظم والی دعا کا ورد کرنا شروع کر دیا۔ نتیجہ حسب خواہ نکلا۔ وہ موٹھ اڑتی ہوئی میرے سر پر آئی اور اسی تیزی سے مڑی جیسے کسی نادیدہ ہاتھ نے اسے پکڑ کر واپس پھینک دیا ہو۔ وہ موٹھ انہی پجاریوں کے سر پر گردش کرنے لگی تھی اور وہ سب خوف زدہ انداز میں چیخ رہے تھے۔ ”اوم...... ہرنگ کرنگ مہا یگ“۔

میں نے یہ منتر دھرم سنگھ سے سنا تھا۔ اسی نے بتایا تھا کہ یہ ”گائیتری منتر“ کہلاتا ہے اور ہر مصیبت کے وقت پڑھا جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے ہم آیتِ ربانی ”آیت الکرسی“ پڑھ کر اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرتے ہیں۔

میں ان سب کی چیخ و پکار سے محظوظ ہو ہی رہا تھا کہ بڑے پجاری نے کچھ پڑھ کر موٹھ کی طرف پھونک ماری‘ موٹھ میں جمع شدہ آگ الٹ کر زمین پر گر گئی۔ ہنڈیا بھی ٹوٹ کر بکھر گئی۔

”دیکھ لیا اپنے منتر کا حشر؟ اب اگر کوئی اور منتر یاد ہے تو اسے بھی آزما لو۔“ میں طنزیہ انداز میں بولا۔

”یہ ابتدا ہے۔ تجھے میں ابھی بتاتا ہوں کہ ہم کالی مائی کے بھگتوں سے ٹکرانے کا انجام کیا ہوتا ہے۔“ اسی پجاری نے چیخ کر کہا۔

”تیری اوقات کیا ہے‘ میرے ساتھ میرا اللہ ہے۔ تو اپنی فکر کر‘ اب میں بھی جواب دینے والا ہوں۔“ یہ کہہ کر میں نے اسی اسم اعظم والی دعا کو پڑھ کر اس کی طرف پھونک ماری مگر اس سے پہلے ہی ایک چیل نے مجھ پر جھپٹا مارا۔ یہ چیل یکایک ہی نمودار ہوئی تھی اسی لیے میں غچہ کھا گیا۔

چیل نے میرے سر پر پنجہ مارنے کی کوشش کی تھی مگر یہ کوشش اسے مہنگی پڑی تھی۔ اس کے پنجے میرے بالوں سے ٹکرائے تھے کہ اس کے جسم میں آگ بھڑک اٹھی۔

چیل کی کریہہ چیخ کافی دیر تک گونجتی رہی تھی پھر وہ مندر کے اوپر جا گری تھی۔

میں نے ان سب کی طرف دیکھ کر طنزیہ انداز میں کہا۔ ”ابھی کچھ اور باقی رہ گیا ہے تو وہ بھی آزما لو۔“

”تم بہت بڑے گنک (جادوگر) ہو تب ہی تو ہر منتر کا توڑ کر رہے ہو۔“ اسی پجاری نے ہاتھ جوڑ لیے۔

وہ شکست تسلیم کر چکا تھا۔ اس سے میری کوئی دشمنی تو تھی نہیں اس لیے میں نے بھی اسے معاف کر دینے کا ارادہ کر لیا اور مسکرا کر بولا۔ ”تم سب مل کر بھی میرا بال بیکا نہیں کر سکتے اس لیے میرے راستے سے ہٹ جاؤ۔ میں اس لڑکی کو لے کر جا رہا ہوں۔“

”تم اس لڑکی کو نہیں لے جا سکتے۔“

”کیوں؟ مجھے کون روکے گا؟“

”اگر یہ لڑکی یہاں سے گئی تو تم پر کالی مائی کا پرکوپ (غضب) گرے گا۔ یہ اس مندر کی بال داسی ہے اور بال داسی مندر کی ملکیت ہوتی ہے۔“

بال داسی ان عورتوں کو کہا جاتا ہے جنہوں نے خود کو مندر کے لیے وقف کر رکھا ہو۔ یہ مندر کی صفائی ستھرائی کرنے‘ دیوی دیوتا کے سامنے ناچنے کے علاوہ کچھ نہیں کرتی ہیں۔ باہر کے لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ یہ پوری طرح پاک پوتر ہوتی ہیں مگر اندر کی خبر رکھنے والے اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ مظلوم لڑکیاں پجاریوں کے ستم کا شکار ہوتی ہیں۔ اگر میرا بس چلتا تو میں ہر مندر میں پلنے والی داسیوں کو آزاد کرا دیتا‘ اسی لیے میں نے قدرے بلند آواز میں کہا۔ ”اگر روک سکتے ہو تو روک لو۔“ پھر میں نے لڑکی کا ہاتھ پکڑا اور قدم اٹھا دیے۔

وہ سب اپنی جگہ کھڑے ہو کر واویلا کر رہے تھے اور میں تیزی سے ان سب سے دور ہوتا چلا جا رہا تھا۔ میں مرکزی سڑک تک پہنچ چکا تھا کہ سامنے سے آتی ہوئی ایک جیپ نظر آئی۔ اسے میں نے رکنے کا اشارہ دیا۔

شاید اس جیپ کا ڈرائیور رحم دل تھا اسی لیے اس نے جیپ روک لی۔

میں نے لڑکی کو اندر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ لڑکی نے جیپ کا ہڈ پکڑ کر اوپر چڑھنا ہی چاہا تھا کہ ایسا لگا جیسے یکا یک ہی وہ جیپ آگے کی طرف سے کھڑی ہو گئی ہے' بالکل ایسے جیسے کسی نے جیک لگا کر سامنے سے باڈی کھڑی کر دی ہو۔

میں نے چونک کر آگے کی طرف دیکھا۔ یقیناً اس کا قد چھے ساڑھے چھے فٹ ہو گا۔ اس کی رنگت بالکل سیاہ تھی۔ بال گھنگریالے تھے اور کانوں میں موٹے موٹے بالے تھے۔ اس کی آنکھیں بھی پرنکی ہوئی تھیں۔

"ابے تُو ہے کون؟ کیوں ہمیں روکنے کی کوشش کر رہا ہے؟" میں نے جھنجلا کر پوچھا۔

"میں تیری موت ہوں اور شیام جی کا بھگت۔ تُو ان جیسے نوسکھیے پنڈتوں کو شکست دے کر سمجھتا ہے کہ بہت بڑا ودوان (علم والا) بن گیا ہے۔"

"اگر ہمت ہے تو شیام میرے مقابلے میں کیوں نہیں آتا۔ اس سے کہو کہ میرا مقابلہ کرے۔"

"تیری اوقات کہاں کہ تُو ان کا مقابلہ کرے۔"

"ٹھیک ہے تُو ہی مقابلہ کر لے۔" ابھی میں نے اتنا کہا ہی تھا کہ مجھے ایسا لگا کہ میری گدی پر کسی چیز سے چوٹ ماری گئی ہو کیوں کہ آنکھوں کے آگے لال پیلے ستارے سے ناچنے لگے تھے۔

میں نے مڑ کر دیکھا تو مجھے اپنے پیچھے جیپ کا ڈرائیور ہاتھ میں جیک لیے کھڑا نظر آیا۔ شاید اسی نے مجھے جیک سے مارا تھا۔ میں بے ہوش ہونے ہی والا تھا کہ مجھے ایسا لگا جیسے گرم گرم مشروب میرے حلق میں اتر رہا ہو۔ پہلے میں نے سمجھا کہ دانت وغیرہ اکھڑ گئے ہیں اور اس کا خون منہ میں جمع ہو کر نیچے اتر رہا ہے مگر خون میں مٹھاس کب ہوتی ہے جب کہ وہ مشروب خوش ذائقہ تھا۔ مشروب نے گلے سے اترتے ہی میری رگ رگ میں تازگی

بھر دی۔ چوٹ کا اثر زائل ہو گیا اور میں پھر سے اٹھ کھڑا ہوا اور اس کالیے کی طرف دیکھ کر بولا۔ "دھوکے سے مارنا چاہتا ہے؟"

"دھوکا..... کیسا دھوکا۔ جنگ اور محبت میں سب جائز ہے۔" کالیے نے منہ بنا کر کہا۔

ہم ایک دوسرے کے مقابل کھڑے تھے کہ اس نے اپنے ہاتھوں کو لمبا کر کے میری گردن کو پکڑنا چاہا تھا۔ میں جو اس الجھن میں گرفتار تھا کہ وہ مشروب مجھے کس نے پلایا تھا۔ اس مشروب میں کیا تھا؟ آیا وہ حلال تھا بھی یا نہیں کہ اس کے بڑھتے ہاتھوں نے چونکا دیا اور میں نے خود کو پھرتی سے گرا لیا۔ اب میں زمین پر تھا لیکن اس جگہ رکا نہیں تھا بلکہ پھسلتا ہوا دور تک نکلتا چلا گیا تھا۔ مجھ سے زیادہ پھرتی اس لڑکی نے دکھائی تھی۔ وہ دوڑ کر کنارے ہو گئی تھی اور ایک پیڑ کی آڑ میں کھڑی تھی۔

"خوب قلابازیاں کھاتے ہو' لو اب سنبھلو۔" کہہ کر اس نے میری طرف کچھ پھینکا۔

میں نے دوبارہ قلابازیاں کھائیں اور اس کے نزدیک پہنچ گیا اور پھر میں پھرتی سے کھڑا ہو گیا۔ میری پھرتی قابل دید تھی۔ میں اس بار جھٹکے سے کھڑا ہوا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں ٹھان لیا تھا کہ اب مجھے جواب دینا ہے اس لیے میں نے تسبیح کو بائیں ہاتھ میں منتقل کیا اور دائیں ہاتھ سے ایسا بھرپور گھونسا مارا جسے اگر بھینسے پر آزماتا تو وہ تلملا جاتا مگر وہ اپنی جگہ سے ہلا بھی نہیں۔ میں نے تابڑ توڑ کئی مکے مارے لیکن ایک بھی مکا اثر انداز نہ ہوا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے میں گندم کے بورے پر گھونسے مار رہا ہوں۔

میری حیرت ابھی کم بھی نہ ہوئی تھی کہ اس نے مذاق اڑانے کے انداز میں کہا۔

"کب تک اس طرح گدگدی کرتے رہو گے؟ مجھے مارنا چاہتے ہو ناں تو ایسا کرو اس چھرے سے مجھے مارو۔" کہہ کر اس نے اپنی کمر سے لٹکے میان سے ایک ہاتھ سے کچھ چھوٹا چھرا نکال کر مجھے تھما دیا۔

میں نے حیرت بھری نظروں سے چھرے کا معائنہ کیا۔ اس کی دھار کافی تیز نظر آئی۔ شاید ایک دو دن پہلے ہی اسے صیقل کیا گیا تھا۔

میں نے چھرے کو ہاتھوں میں تولا پھر نپے تلے انداز میں اسے پوری قوت سے کالیے کے پیٹ میں گھونپ دیا۔

مجھے ایسا لگا تھا جیسے میں نے چھرا کائی کے ڈھیر پر مارا ہے۔ سرسراتا ہوا چھرا دھنستا چلا گیا تھا حیرت کی بات یہ تھی کہ اس کے جسم سے ایک قطرہ بھی خون کا نہیں نکلا تھا۔ ابھی حیرت رفع بھی نہیں ہوئی تھی کہ اس نے کہا۔ ''ارے بھئی ڈر کس بات کا ہے دوبارہ کوشش کرو۔ شاید کامیابی مل جائے؟'' وہ سینہ کھولے گردن اکڑائے میرے سامنے آ گیا تھا۔ میں نے خنجر پوری قوت سے اس کے سینے میں گھونپ دیا' یوں لگا جیسے میں نے وہ خنجر بھوسے کے گٹھر پر مارا ہو۔ اس بار بھی خون کا ایک قطرہ نہ نکلا۔

''اب میں کیا کروں میرے بدن میں تو خون کا ایک قطرہ بھی نہیں۔ ہاں ایسا کرتا ہوں تمہاری شہ رگ سے تھوڑا سا خون چوس لیتا ہوں۔'' کہہ کر وہ میری جانب ایک قدم بڑھا اور ہاتھ سے خنجر چھین کر اس کی دھار کو دیکھنے لگا پھر اچانک ہی اس نے وحشیانہ انداز میں اچھلنا کودنا شروع کر دیا اور پھر انتہائی سفاکی سے وہ خنجر میری گردن میں اتارنے کی کوشش کی لیکن یہ کیا؟ میں خود بھی حیران رہ گیا۔ اس تیز دھار خنجر کی دھار مڑ گئی۔ جس قوت سے وہ خنجر میری گردن میں پیوست کیا گیا تھا۔ اس کے تحت اس کا وہ پہلا اور آخری وار ہونا چاہیے تھا لیکن ایسا نہ ہوا۔ اس نے حیرانی سے مڑے ہوئے خنجر کو دوبارہ دیکھا اور پھر اسے چٹکیوں سے پکڑ کر سیدھا کر دیا۔

اس بار اس نے خنجر میرے سینے پر مارا لیکن اس بار وہ خنجر دوبارہ سیدھا ہونے کے قابل بھی نہ رہا۔

''اوئے تو کھاتا کیا ہے رے؟'' اس نے مجھے بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کیا تیرا بدن پتھر کا ہے؟''

''نہیں یہ بات نہیں ہے۔ تیری موت بن کر آیا ہوں نا اس لیے تیری قوت چھین لی ہے۔ اب تُو کیچوے کی طرح بے ضرر بن چکا ہے اور یہی تیری شکست ہے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا۔

اس نے حیرت بھری نگاہوں سے اپنے ہاتھ کو دیکھا پھر اچانک ہی اس نے ایک سمت چھلانگ لگا دی اور بھاگتا چلا گیا۔ آگے آگے وہ تھا اور پیچھے پیچھے میں' میرے پیچھے وہ لڑکی بھی چیختی ہوئی دوڑ رہی تھی۔ میں نے ایک لمحے کو مڑ کر دیکھا تو حیرت کا جھٹکا لگا لڑکی کے ہاتھ میں وہی چھرا تھا جو مڑ گیا تھا مگر اب پھر سے سیدھا نظر آ رہا تھا۔ یہ وہی چھرا تھا جس

سے ہم نے قوت آزمائی کی تھی۔ چھرا سرخ ہو رہا تھا۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں ڈرائیور کا سر تھا جسے اس نے بالوں سے پکڑ رکھا تھا۔ اس حالت میں اسے دیکھنے والا خود بھی خوفزدہ ہو جاتا مگر وہ خود خوفزدہ تھی۔

میں سمجھ گیا کہ یہ کام اس نے نہیں کیا ہے اس کے ذریعے کرایا گیا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے کسی نادیدہ قوت نے میرے ناتواں بدن میں نئی قوت بھر کر اس عفریت سے ٹکرا دیا تھا۔

میں نے ادھر سے توجہ ہٹا کر اس دوڑتے ہوئے عفریت پر نظر ڈالی اور اپنی رفتار بڑھا دی۔ وہ مندر کے قریب پہنچ چکا تھا۔ مندر کو دیکھ کر میرے ذہن میں ایک عجیب سی کیفیت ابھر آئی۔ میں اس مندر سے دور رہ کر اپنا کام کرنا چاہتا تھا مگر قسمت مجھے یہیں لے آتی تھی گو کہ اس مندر میں داخل ہوتے ہی میری قوت کم ہو جاتی اور باطل قوت شہہ پا جاتی ہے۔

وہ عفریت اس مندر میں داخل ہو کر نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ میں اپنی جگہ رک گیا کیوں کہ بغیر پیش بندی کے میں اندر داخل ہونا نہیں چاہتا تھا۔ لڑکی بھی آ کر میرے برابر کھڑی ہو گئی۔ کٹا ہوا سر اور خنجر اب تک اس کے ہاتھوں میں تھا۔ میں نے ایک نظر کھنڈر پر ڈالی اور اس لڑکی کی طرف مڑ کر بولا۔ ''ان دونوں کو لے کر کیا گھر جانا ہے۔ چلو پھینکو۔''

میری آواز سنتے ہی اس نے ایک لمبی سانس کھینچی اور اس کٹے ہوئے سر کو دور اچھال دیا پتا نہیں یہ اس سر کا کمال تھا یا اس مندر کا سحر کہ مجھے ایسا لگا جیسے اس مندر سے ایک ساتھ سینکڑوں کی تعداد میں ہاتھ بلند ہوئے اور اس کٹے ہوئے سر کو کیچ کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ ایک ہاتھ اسے پکڑتا تھا کہ دوسرا ہاتھ جھپٹ لیتا۔ ایسا عجیب تماشا قصے کہانیوں میں تو بار ہا سنا تھا مگر جب آنکھوں سے دیکھا تو یقین کرنا ہی پڑا کہ اس دنیا میں کوئی بات ناممکن نہیں ہے۔ دنیا عجائبات سے بھری ہے بس آنکھیں کھلی رہنا شرط ہے۔

سمندر میں ڈبکی لگاؤ تو آبی جاندار نظر آتے ہیں۔ آسمان پر جاؤ تو پرندے' نماز میں جھکو تو رحمٰن کی قربت ملے اور صراط مستقیم سے بھٹک جاؤ تو شیطان کے جنگل میں پھنستے چلے جاؤ۔ یہ شیطان کی دنیا بھی بہت وسیع ہے۔ کیا کیا نہیں ہے وہاں ہر غلط بات بھی سچ دکھائی دیتی ہے۔ یہی مناظر اگر میں کسی سے سنتا تو جھوٹ سمجھتا مگر سچائی کو جھٹلا نہیں سکتا تھا کیوں کہ اپنی آنکھوں سے یہ سب دیکھ رہا تھا۔ معمولی سی بات ہے ہر صاحب ایمان نے پڑھا ہوگا کہ

حضور پُر نور سے پُر خاش رکھنے والے ایک ساحر نے کس طرح ایک گڑیا بنا کر اس میں سوئیاں چبھو کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جان لینے کی کوشش کی تھی۔ اس راز سے حضرت جبرائیل نے پردہ ہٹا دیا تھا ورنہ تو سحر آپؐ پر اثر کر جاتا۔ جب حبیب خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر سحر اثر کر سکتا ہے تو ہم آپ کیا ہیں؟ یہی وجہ تھی کہ ایسے مناظر دیکھ کر بھی میں حیرت زدہ نہ ہوتا اور لاحول پڑھتے ہوئے پیچھے ہٹ جاتا۔

لڑکی میرے ساتھ تھی۔ میں اس کے ذریعے ان بدبختوں کا شکار کرنا چاہتا تھا۔ یہ بہترین چارا ثابت ہو سکتی تھی۔ اسے اپنے ساتھ لے کر میں اس ٹیلے کی طرف بڑھنے لگا تھا جس پر کسی بزرگ کی قبر تھی۔ دھرم سنگھ نے بتایا تھا کہ وہ ''نوگزا پیر'' کی قبر ہے اور مسلمانوں سے نفرت کرنے والے ہندو بھی منتیں مرادیں مانگنے اس قبر پر آتے ہیں۔ وہ قبر تھی بھی نو گز کی اسی لیے اسے نوگزا کہا جاتا تھا۔ ایسی قبریں گنج شہیداں میں ہوتی ہیں۔ کئی لاشوں کو ایک ساتھ دفنا کر بنائی گئی قبریں ہی اتنی بڑی ہوتی ہیں۔ صاحبانِ قبر بھی متقی و پرہیزگار ہوں گے اس لیے تو دشمنوں کی مرادیں بھی پوری ہو جاتی تھیں۔ مجھے یقین تھا کہ اس ٹیلے پر بری روح نہیں آ سکتی اسی لیے ادھر بڑھتا جا رہا تھا۔ پھر وہ ٹیلہ کسوٹی کا کام بھی دے سکتا تھا۔ ابھی تک میں اس لڑکی کی حقیقت سے بے خبر تھا۔ اگر یہ لڑکی بھی دشمنوں کی آلۂ کار ہوئی' شیطان کی غلام ہوئی' کبھی بھی اس نے منتر وغیرہ سیکھا ہوگا تو وہ کبھی بھی اس ٹیلے پر چڑھ نہ پائے گی۔

اب ہم اس ٹیلے کے بالکل قریب پہنچ چکے تھے۔ قبر کے سرہانے ایک بڑا سا پھل دار درخت تھا۔ چاندنی میں اس کا سایہ قبر پر پوری طرح پھیلا ہوا تھا۔ میں اسی پیڑ کے نیچے کچھ دیر آرام کرنا چاہتا تھا۔ لڑکی میرے ساتھ سائے کی طرح چل رہی تھی۔ اوپر چڑھتے ہوئے میں نے پوچھا۔ ''اچھا یہ بتاؤ اس سکھ لڑکی کو ان لوگوں نے کہاں رکھا ہے؟''

''میاں جی! وہ لڑکی سکھ ہو کر بھی آپ کے دھرم کو صحیح مانتی ہے۔ بڑے پنڈت نے اسے ڈرانے دھمکانے کی پوری کوشش کر لی ہے مگر وہ جھکنے پر بالکل تیار نہیں ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ میاں جی کا دھرم سچا ہے تبھی تو وہ تم لوگوں کو پراجیت (شکست) کر رہا ہے۔''

''تمہارے خیال میں میرا مذہب کیسا ہے؟'' میں نے اسے ٹٹولنے کے لیے پوچھا۔

''میاں جی! برا نہ مانیں۔ ہر دھرم سچا ہے۔ اسے خراب کرتے ہیں اس کے ماننے والے' اب دیکھیں نا! آپ کا دھرم کہتا ہے اس دنیا میں ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر آئے۔ کیا

تمام پیغمبر صرف عرب میں آئے؟ کوئی نہ کوئی پیغمبر یہاں بھی تو آیا ہوگا۔ اسی نے ہمارے ہندو دھرم کی بنیاد رکھی ہوگی۔ جس طرح ہر نبی کے ماننے والوں نے اپنے نبی کے بعد اپنے دھرم کی شکل بدل دی اسی طرح ہندو دھرم بھی بدل گیا ہوگا اور اس میں عبادت کے لیے مورتی پوجا گھس آئی ہوگی۔''

لڑکی نے مجھے لاجواب کر دیا تھا میں سوچنے لگا کہ ہو نہ ہو یہ لڑکی بہت چالاک ہے کھل کر جواب نہیں دے رہی ہے۔ خیر! یہ ڈال ڈال چل رہی ہے تو میں بھی پات پات چلوں گا اور اگر یہ غلط ہے تو میں اس کے چہرے سے نقاب نوچ کر رہوں گا۔

رانی کس حال میں ہے' دھرم سنگھ کہاں ہے اس کی خبر مجھے بالکل نہ تھی پھر بھی مجھے اپنے رب پر بھروسا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ فتح میرا مقدر ہے۔ باطل پر حق کو فتح ملتی ہے۔ میں ہر حال میں رانی کو حاصل کر کے رہوں گا۔

اس عہد کے ساتھ میں اس پیڑ تک پہنچ گیا پھر اس سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ لڑکی بھی میرے سامنے بیٹھ گئی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ''اب اپنے بارے میں کچھ بتاؤ۔''

''میں ایک غریب گھرانے سے تعلق رکھتی ہوں۔ باپ مر چکا ہے بوڑھی ماں بینائی سے محروم ہے۔ ایک چھوٹا بھائی جیتر ہے میں کسی نہ کسی طرح گھر کی دال روٹی چلاتی ہوں۔ مندر میں پوجا کرنے آئی تھی کہ بڑے پجاری شیام نے مجھے قید کر لیا۔ وہ مجھے زبردستی مندر کی داسی بنانا چاہتا ہے۔ تم مسلمان ہو۔ شاید تمہیں اس کا علم نہ ہو کہ مندروں کی داسیاں پجاریوں کے لیے وقف ہوتی ہیں۔ دھرم کے نام پر کچھ دھوکے باز پنڈت لوگوں کو دھوکا دیتے ہیں۔ سب کے سامنے اسے بال کماری کہتے ہیں لیکن اکیلے میں پاپ کا دروازہ کھول لیتے ہیں۔ اپنے لیے نرگ کا راستہ چنتے ہی ہیں ساتھ میں داسیوں کو بھی گھسیٹ لیتے ہیں۔''

''تو تم انہی کے چنگل سے نکل بھاگی تھیں؟''

''جی ہاں!''

''اگر یہ سچ ہے تو میں تمہاری مدد کروں گا۔ شاید تمہارے حالات بدل جائیں لیکن شرط یہ ہے کہ تم میری بھرپور مدد کرو۔''

''تم مجھ پر اعتماد کر سکتے ہو۔ میں خود بھی چاہتی ہوں کہ یہ مندر ایسے اوچھے پنڈتوں سے آزاد ہو جائے اور یہاں صرف بھگوان کی پوجا ہو۔ ستیہ (سچائی) کا بول بالا ہو۔''

''سورج نکلنے کے بعد تم اپنے گھر چلی جانا۔'' میں نے کہا اور اپنے ذہن کا رخ موڑنے کی کوشش کرنے لگا۔ اب میں رانی کو رہا کرانے کا طریقہ سوچ رہا تھا۔

''کس سوچ میں ڈوب گئے؟'' رادھیکا نے پوچھا۔

''رانی کو انہوں نے کہاں رکھا ہے۔ اس کی خبر تو تمہیں ہوگی؟''

''ہاں مجھے معلوم ہے۔ اگر تم اسے آزاد کرانا چاہتے ہو تو میں تمہاری مدد ضرور کروں گی مگر اچھی طرح سوچ لو وہاں خطرہ ہے۔ جان بھی جا سکتی ہے۔''

''مجھے اپنی جان کی پرواہ نہیں۔ تم مجھے وہاں تک لے چلو۔''

''تو پھر وقت برباد نہ کرو، اٹھو اور میرے ساتھ چلو۔ تم میرے محسن ہو میں تمہاری مدد ضرور کروں گی۔'' رادھیکا نے کھڑے ہو کر کہا۔

میں شش پنج میں گرفتار تھا۔ پتا نہیں یہ لڑکی سچ بول رہی ہے یا مجھے پھانسنے کے لیے آئی ہے۔ نو رسک نو گیم! اس کہاوت نے مجھے تقویت دی اور میں کھڑا ہو گیا۔

مزار کے نزدیک جا کر فاتحہ پڑھی اور دل ہی دل میں صاحب مزار کو مخاطب کر کے کہا۔ ''آپ بھی میرے لیے خداوند کریم سے دعا کریں کہ میں اس کفر کے قلعے کو ڈھا سکوں۔''

فاتحہ پڑھ کر میں ٹیلے سے نیچے اترنے لگا۔ چاندنی پوری طرح پھیل چکی تھی اس لیے اترتے وقت میری رفتار زیادہ تیز تھی۔ رادھیکا بھی اسی تیزی سے نیچے اتر رہی تھی۔ ہم دونوں ایک نئے معرکے کو سر کرنے کے لیے بڑھ رہے تھے۔ ایک ایسی جنگ کرنے جا رہے تھے جس میں عام ہتھیار کوئی کام نہ آتے۔ چاقو، چھری، بندوق کی جگہ علم دینی معاون ثابت ہوتا۔

میرے ایک ہاتھ میں کراماتی تسبیح تھی اور انگلی میں وہ انگوٹھی جس نے کئی معرکوں میں میری مدد کی تھی۔ جو میرے بزرگوں کا تحفہ تھی۔ یہ دونوں میرے لیے بہت اہم ہتھیار تھے۔ انہی کی مدد سے مجھے جنگ جیتنا تھی پھر مجھے وہ دعا بھی مدد دیتی جس میں اسم اعظم تھا۔ اللہ تعالیٰ کا وہ نام جس میں سب سے زیادہ قوت ہے۔ جو دنیا کا نقشہ بدل سکتا ہے۔ اس دعا میں بہت زیادہ اثر تھا اس لیے میں بلا جھجک اسے پڑھ رہا تھا۔ کامیابی مل رہی تھی۔ خطروں سے بچ رہا تھا۔

مندر اب زیادہ دور نہیں تھا۔ ہم اس کے بہت قریب پہنچ چکے تھے۔ بس ایک فرلانگ کا فاصلہ تھا کہ مندر کا دروازہ کھلا اور اس عفریت کے کندھے پر سوار شیام نظر آیا۔ وہی شیام جس کی دہشت سے پورا علاقہ لرزتا تھا۔ جس کی سحر و ساحری کا چرچا دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔ جو اپنے آپ میں ایک بہت بڑی قوت تھا۔ وہ انتقام لینے کے لیے میرے مقابل آ چکا تھا۔ میں نے ایک لمحے میں فیصلہ کر لیا کہ مجھے کیا کرنا ہے اس لیے میں نے فی الفور اسم اعظم والی دعا کا ورد شروع کر دیا۔ اب میں منتظر تھا کہ وہ اپنا وار کرے تاکہ میں اسے اسی کے وار سے واصل جہنم کر سکوں۔

شیام کی سواری بنا وہ کالیا میری طرف خونخوار نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے منہ ہی منہ میں کچھ بدبدا کر میری جانب پھونک ماری۔ آپ نے اکثر سگریٹ نوش کو منہ سے دھوئیں کے چھلے نکالتے دیکھے ہوں گے بالکل وہی منظر سامنے تھا۔ فرق اگر تھا تو دھوئیں اور آگ کا۔ سگریٹ نوش دھوئیں کے چھلے نکالتے ہیں اور وہ آگ کے چھلے نکال رہا تھا۔ ایک کے پیچھے ایک، کئی چھلے میری طرف بڑھے۔ شاید یہ لاشعور کا کمال تھا کہ میں نے پھرتی سے تسبیح والے ہاتھ کو آگے کر دیا جیسے میں اسی تسبیح سے ان چھلوں کو روکنا چاہتا ہوں۔

شعلوں کے چھلے آگے بڑھے تو ادھر بھی ایک کرامت نظر آئی۔ میری انگلی میں پھنسی انگوٹھی سے عجیب سی شعاعیں نکلیں اور ان شعلوں سے ٹکرائیں۔ نظروں کو خیرہ کر دینے والی چمک اور سماعت پر اثر ڈالنے والی کڑک پیدا ہوئی اور شعلوں کے چھلے بجھتے چلے گئے۔ ایک کے بعد ایک چھلے ختم ہوتے چلے گئے۔

اس کرامت کو دیکھ کر شیام نے کہا۔ ''اچھا ہے! مزہ آیا۔ تُو نے اگنی چکر بان کا توڑ کر لیا مگر یہ ابتدا ہے لے اس ''بان'' کا توڑ کر تو جانوں!'' کہہ کر اس نے اپنی جھولی سے کوئی چیز نکالی اور میری طرف اچھال دی۔

وہ چیز ہوا میں اڑتی ہوئی آئی اور میرے قدموں کے قریب گری۔ میں نادانستہ طور پر اچھل کر دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ ساتھ ہی ساتھ میری نگاہوں نے اس چیز کا احاطہ کر لیا۔

وہ ایک کڑیالا سانپ تھا، لجلجا سا، دھیرے دھیرے رینگتا ہوا میری طرف بڑھ رہا تھا۔ میں اس سانپ کی حشر سامانی سے واقف تھا کہ اس سانپ کا ڈسا پانی بھی نہیں مانگتا اور آناً فاناً دم توڑ دیتا ہے۔ اس سانپ سے بچنا زیادہ مشکل نہیں تھا کیوں کہ یہ حد سے زیادہ

سست واقع ہوا ہے مگر حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ آگے بڑھتا جارہا تھا اور بچے دیتا جارہا تھا۔

سانپ انڈے دیتا ہے۔ بچے دینے والا سانپ پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ تعجب خیز بات یہ تھی کہ وہ سانپ کے بچے برق رفتاری سے بڑے ہوتے جارہے تھے۔ یعنی ادھر پیدا ہوتے اور ادھر جوان ہوجاتے یعنی ایک ہاتھ لمبے ہوجاتے۔ ان سب کا رخ میری طرف تھا۔

میں دھیرے دھیرے پیچھے ہٹ رہا تھا۔ میرے ساتھ رادھیکا بھی پیچھے ہٹ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر بھی خوف کے سائے رینگ رہے تھے۔ وہ حد سے زیادہ ڈری ہوئی نظر آرہی تھی۔ میں خود بھی خوف محسوس کررہا تھا کہ مجھے ایسا لگا جیسے کسی نے میرے کان کے قریب سرگوشی کی ہو۔ ''ارے بدبخت اسم اعظم والی دعا پڑھ۔ اس سحر کا توڑ وہی ہے۔''

بس میں نے اس دعا کا ورد شروع کردیا اور دیکھتے ہی دیکھتے مغربی افق پر سیاہی پھیل گئی۔ ادھر سے زنانے کی آوازیں آرہی تھیں۔ شیام نے بھی مڑ کر ادھر دیکھا۔

ہماری نظریں بھی ادھر ہی جمی ہوئی تھیں کہ سینکڑوں کی تعداد میں اڑتے ہوئے باز قریب آتے نظر آئے۔ چاندنی میں ان کی ہیبت ناکی بڑھ گئی تھی۔ رہ رہ کر وہ آوازیں بھی نکال رہے تھے۔

جیسے ہی وہ جھنڈ قریب پہنچا' رادھیکا خوف سے سہم کر مجھ سے چمٹ گئی۔ میں ورد میں مشغول تھا۔ وہ میرے لیے غیر محرم تھی اس لیے میں نے اسے جھٹک کر دور کیا اور بولا۔

''خبردار میرے جسم سے دور رہنا۔''

اسے ڈانٹ کر میں نے پھر سے ورد شروع کردیا۔ بازوں نے غوطہ لگایا اور وہ سب سانپوں کو پنجوں میں دبا دبا کر اڑنے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے زمین صاف ہوگئی۔ ایک بھی سانپ نہ بچا۔ باقی بازوں نے شیام اور اس کالیے پر حملہ کردیا جو اسے کندھے پر بٹھائے ہوئے تھا۔ بازوں کی یلغار نے ان دونوں کو گھبرا دیا تھا کیوں کہ باز پنجوں اور چونچ کا بے دریغ استعمال کررہے تھے اور وہ دونوں لہولہان ہوچکے تھے۔ اس اچانک افتاد نے ان دونوں کو بوکھلا دیا تھا مگر شیام نے جلد ہی اپنے اوسان بحال کرلیے اور کچھ پڑھ کر پھونکا۔ تبھی ایسا لگا جیسے آسمان پر آگ لگ گئی ہو۔ ہر طرف سے آگ کے گولے لپکنے لگے تھے اور باز ان کی زد میں آکر نیچے گرتے جارہے تھے۔

میں نے ورد جاری رکھا تھا۔ شاید یہ اسی کا کمال تھا فوراً ہی آسمان پر گھنگھور گھٹائیں چھا گئیں اور ٹوٹ کر بارش شروع ہوگئی۔ بارش کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ آتشی گولے آسمان ہی پر بجھنے لگے جب کہ بارش کا ذرا بھی اثر بازوں پر نہیں ہورہا تھا۔ وہ اسی طرح آسمان پر اڑ رہے تھے اور رہ رہ کر غوطہ بھی لگا رہے تھے۔ ہر غوطے میں وہ ان دونوں پر چونچ یا پنجہ ضرور مارتے۔

کالیا حد سے زیادہ بوکھلاہٹ کا شکار تھا۔ وہ شاید کچھ اور پڑھتا کہ مجھے ایسا لگا جیسے کسی نے مجھے دھکا دیا۔ اس دھکے سے میں اوندھے منہ گرنے لگا۔ میرا داہنا ہاتھ رادھیکا نے پکڑ لیا تھا۔ وہ بھی اس جھٹکے پر لڑکھڑائی تھی اور ایسا اس نے سنبھلنے کے لیے کیا تھا۔ گرتے گرتے وہ سنبھلی اور سنبھلتے ہی اس نے سیدھ میں دوڑ لگادی۔ اس کا رخ مندر کی طرف تھا۔

''اے اے ادھر مت جاؤ۔'' میں نے اٹھتے ہوئے کہا مگر وہ رکی نہیں۔ دوڑتے ہوئے مندر میں داخل ہوگئی۔

''ارے مورکھ کسے آواز دے رہا ہے۔ وہ اب نہیں آئے گی۔ اسے میں نے ہی تیرے پیچھے لگایا تھا۔'' شیام ہنستے ہوئے بولا۔ ''وہ ہمارے مندر کی داسی نہیں تھی پوری طرح پاک پوتر تھی۔ اسے میں نے دھونس دھمکی دے کر تیار کیا تھا صرف اس لیے کہ اگر وہ مندر کی داسی ہوتی تو تو پہچان لیتا۔''

''تو یہ تیری بھیجی ہوئی تھی؟'' میں نے کہا۔

''ہاں! کیوں کہ اس انگوٹھی کا تیرے پاس رہنا ہمارے لیے خطرناک تھا۔ ہماری تباہی یقینی تھی اسی لیے تجھ سے انگوٹھی چھیننے کے لیے اسے تیار کیا تھا اور وہ انگوٹھی حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئی ہے۔ اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھ۔''

میں نے اپنی انگلی کی طرف دیکھا۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ انگوٹھی غائب تھی۔ جب میں لڑکھڑا کر گر رہا تھا۔ شاید اس وقت اس نے انگوٹھی اتار لی تھی۔ میں بری طرح چلا اٹھا کیوں کہ میری ساری محنت رائیگاں گئی تھی اگر وہ ساحرہ ہوتی۔ جادوٹونا کرنے والی ہوتی تو اس انگوٹھی کو ہاتھ لگاتے ہی جل کر خاک ہوجاتی۔ وہ ہر برائی سے بچی ہوئی تھی اسی لیے انگوٹھی نے اس پر اثر نہیں ڈالا تھا۔ میں ٹوٹ کر رہ گیا تھا۔

''اب موت تیرا مقدر ہے۔ چچ چچ چچ...... تو جوان موت مرنے والا ہے اور تجھ پر

رونے والا بھی کوئی نہیں۔ پورے بھارت ورش میں تیرا کوئی نہیں ہے۔'' شیام مذاق اڑانے کے انداز میں بول رہا تھا۔

''گرتے ہیں شہسوار ہی میدان جنگ میں' وہ طفل کیا گرے جو گھٹنوں کے بل چلے۔ جنگ میں کبھی ایک کا پلہ بھاری ہوتا ہے کبھی دوسرے کا۔ یاد رکھنا وہ انگوٹھی میرے لیے ہے اس لیے مجھے مل کر رہے گی۔''

''تو زندہ رہے گا تب ناں!'' کہہ کر اس نے کوئی منتر پڑھا اور میری طرف پھونک ماری۔ مجھے ایسا لگا جیسے میں ہوا میں اڑنے لگا ہوں۔ بگولہ مجھے اڑائے لیے جا رہا ہے۔ میں ہاتھ پاؤں مار رہا تھا مگر خلا میں ''ٹامک ٹوئیاں'' مارنے کے مترادف چکرانے پر مجبور تھا۔ عقل کام نہیں کر رہی تھی۔ میں کیا کروں؟ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ بس اڑتا چلا جا رہا تھا۔ میری منزل کہاں تھی؟ خود مجھے بھی خبر نہ تھی۔ کسی کٹی پتنگ کی طرح میں بس اڑے چلا جا رہا تھا۔ ذہن قابو میں نہ تھا اسی لیے میں صرف ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ اگر بوکھلاہٹ سوار نہ ہوتی تو اپنے اللہ کو ہی پکار لیتا۔ یا پھر دعائے اسم اعظم کا ورد کر لیتا۔ مگر ذہن پر تو گویا گرد چھا گئی تھی۔

میں خلا کی بے کراں وسعت میں کھو گیا تھا کہ مجھے جھٹکا لگا۔ یقیناً میرے ذہن پر سحر طاری تھا جو جھٹکا لگتے ہی کرچی کرچی ہو گیا۔ مجھے ایسا لگا جیسے نیچے سے ایک شعاع ابھری تھی اور میرے آگے دیوار بن گئی تھی۔ میں اس دیوار سے اس طرح ٹکرایا گویا وہ مجسم' ٹھوس ہو اور میں نیچے کی طرف گرتا چلا گیا۔ زمین سے ٹکرایا ضرور تھا مگر چوٹ نہ لگی تھی۔ ایسا لگا تھا جیسے میں نرم دلدل میں گرا ہوں۔ فوراً ہی کپڑے جھاڑتا ہوا کھڑا بھی ہو گیا تھا۔

پھر میں نے اطراف پر نظر ڈالی۔ میں اسی پہاڑی پر کھڑا تھا جس پر نوگزا پیر کی قبر تھی اور اس پہاڑی کے چاروں طرف بہت بڑے بڑے قد آور خنزیر کھڑے تھے' لمبے لمبے دانتوں والے۔ ان کی خصلت سے میں واقف تھا۔ وہ انتہا درجے کے خونخوار ہوتے ہیں۔ اگر جنگلی ہوں تو اپنے شکار کو دانتوں سے پھاڑ دیتے ہیں۔ انسانوں کے تو ازلی دشمن ہوتے ہیں۔ بپھر جائیں تو بندوق سے بھی نہیں رکتے۔ ریوڑ پر گولیاں چلاتے رہیں سامنے کی قطار والے مرتے رہیں گے اور پیچھے والے انہیں پھلانگ کر آگے بڑھتے رہیں گے۔ ایسے خطرناک جانوروں کا یوں گھیرا بنا کر کھڑے ہونے کی کوئی نہ کوئی خاص وجہ ضرور ہو گی۔

وہ مجھے منہ اٹھا اٹھا کر مجھے دیکھ رہے تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کدھر بھاگوں کیوں کہ وہ کسی بھی وقت ٹیلے پر آ سکتے تھے۔

خطرہ برابر بنا ہوا تھا کہ وہ کسی بھی وقت یلغار کر سکتے تھے۔ میں اس بات پر غور کر رہا تھا کہ کدھر جاؤں۔ کیسے ان سے بچوں۔ یہ ٹیلہ کوئی پہاڑ تو تھا نہیں' وہ سب ایک ساتھ چڑھ آئے تو میرا بچنا محال تھا۔ میں نے اطراف کا جائزہ لیا تو ایسی کوئی جگہ نظر نہ آئی جہاں میں ان کی یلغار سے محفوظ رہتا۔ ٹیلے کے چاروں طرف وہ غول در غول جمع تھے۔

ٹیلے پر بچنے کی صرف ایک صورت تھی کہ میں اس درخت پر چڑھ جاتا جو کافی اونچا اور پھیلا ہوا تھا۔ اس نے ٹیلے پر بنے نوگزا پیر کے مزار پر سایہ کر رکھا تھا۔ تبھی میری ذہن میں جھماکا سا ہوا اور میں اس مزار کے قریب پہنچ گیا۔ صدق دل سے فاتحہ پڑھی اور دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔ ''اے صاحب قبر! میں حق کی سربلندی کے لیے اس کفرستان میں آیا ہوں۔ میری مدد کیجیے کہ میں سحر و ساحری کے اس طوفان سے بہ حفاظت باہر نکل سکوں اور اپنی خاندانی انگوٹھی واپس لے سکوں۔''

میری دعا ابھی ختم بھی نہ ہوئی تھی کہ مجھے ایسا لگا جیسے کوئی میرے برابر میں آ کر کھڑا ہو گیا ہے۔ میں نے ادھر دیکھنے کی کوشش کی مگر کوئی نظر نہیں آیا۔ صرف احساس تھا۔ میں نے اپنا تخیل سمجھا اور دوبارہ اس ریوڑ کی طرف دیکھا۔ نیچے گروہ در گروہ کھڑے خنزیروں میں بے چینی پھیلتی محسوس ہوئی۔ وہ سب اپنی اپنی جگہ کھڑے میری طرف دیکھ دیکھ کر عجیب عجیب سی آوازیں نکال رہے تھے مگر ان کے انداز میں جارحیت نہ تھی' خوفزدگی تھی۔ جیسے وہ سب ڈرے ہوئے ہوں۔

اس خوف کی وجہ کیا ہے۔ میں ابھی اسی پر غور کر رہا تھا کہ مجھے ایسا لگا جیسے کسی نے مجھے مخاطب کیا ہو۔ میں نے چونک کر اِدھر اُدھر دیکھا مگر وہاں کوئی نہ تھا۔ چاندنی میں پورا میدان صاف صاف نظر آ رہا تھا۔ اگر کوئی ہوتا تو فوراً نظر آ جاتا اس لیے میں نے اپنا وہم سمجھا مگر یہ کیا؟ وہی سرگوشی دوبارہ سنائی دی۔

اس بار میں نے واضح انداز میں سنا جیسے کوئی مجھ سے کہہ رہا ہو کہ خوف زدہ ہونا مسلمانوں کا شیوا نہیں ہے۔ تم سورہ قریش کا ورد کرو ساتھ ہی ساتھ معوذتین پڑھو یہ سورتیں تمہاری نجات کی ضامن ہیں۔

میں نے بغیر کچھ سوچے زور زور سے تلاوت شروع کردی۔ واقعی قرآن پاک عجائبات کا مظہر ہے۔ اس میں ہر وہ بات ہے جو انسانوں کی نجات کی ضامن ہے۔ ہدایت کے لیے مکمل رہنما ہے' حالات بدلنے کے لیے معجزہ۔ واقعی یہ معجزنما کتاب ہے۔ تلاوت کی آواز فضا میں پھیلتے ہی خنزیروں کے گروہ میں ہلچل مچ گئی۔ ان کی اچھل کود بڑھ گئی پھر کچھ ہی دیر میں وہ سب اپنی جگہ سے غائب ہو گئے۔ ایسے جیسے ان کا کبھی وجود ہی نہ رہا ہو۔ میں سمجھ گیا کہ یہ بھی شیام کی کارستانی تھی۔ یہ اسی نے بھیجے تھے مگر میری مدد کس نے کی تھی۔ یہ بات ہنوز راز میں تھی۔

میں دھیرے دھیرے ٹیلے سے نیچے اتر رہا تھا کہ مجھے لگا جیسے کسی نے میرے کان میں سرگوشی کی ہو۔ ''شکریہ ادا نہیں کرو گے؟''

میں چونک کر رک گیا اور میری نظر خود بخود نوگزا پیر کی قبر پر ٹک گئی۔ میرے دل نے کہا۔ ہونہ ہو میری مدد انہوں نے ہی کی ہو گی اور میرے ہاتھ فاتحہ کے لیے اٹھ گئے۔ مردے کے لیے سب سے بڑا تحفہ یہی ہے کیوں کہ یہی سورہ فاتحہ اس کے لیے توشہ ہے۔ اس کے عذاب کو کم کرنے کا ضامن ہے۔

میں فاتحہ پڑھ کر خود کو ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا پھر اس ٹیلے سے نیچے اتر آیا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے میں نے بہت بڑا معرکہ سر کرلیا ہو جب کہ اصل معرکہ ابھی باقی تھا۔

رانی ان دھوکے باز پنڈتوں کے قبضے میں تھی۔ اسے بھی چھڑانا ضروری تھا۔ میں آہستہ آہستہ نیچے اتر آیا۔ مجھے جو کچھ بھی کرنا تھا آج ہی کرنا تھا۔ میرے پاس وقت بالکل نہیں تھا۔ میرا ویزا صرف تین ماہ کا تھا جس میں بارہ دن گزر چکے تھے۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ رانی میری وجہ سے شکار بنی تھی۔ اسے جلد از جلد آزاد کرانا میری ذمے داری تھی۔ اسے کس طرح آزاد کرایا جائے، میں یہی سوچتا ہوا پھر سے آگے بڑھنے لگا۔ اس بار میں نے سوچ لیا تھا کہ مندر کے قریب پہنچ کر میں فقیر بابا کے ساتھ اپنے دیگر حامیوں کو بھی آواز دوں گا کیوں کہ شیام میرے اکیلے کے بس کا نہیں ہے۔ اسے شکست دینے کے لیے ایک پوری فوج چاہیے۔

میں ان سب کو کیسے آواز دوں ابھی اس پر غور کر رہا تھا کہ مجھے ایسا لگا جیسے کسی نے مجھے آگے بڑھنے کے لیے کہا ہو۔

میں اس ٹیلے سے نیچے اترا ہی تھا کہ مجھے اپنے ہاتھ پر کسی کا لمس محسوس ہوا جیسے کسی نے میرے ہاتھ کو تھام لیا ہو۔ میں نے چونک کر اپنے بائیں ہاتھ کی طرف دیکھا۔ ادھر کوئی بھی نہ تھا پھر بھی میں اپنے ہاتھ پر کسی کا لمس محسوس کر رہا تھا۔ تبھی میرے دماغ میں یہ بات گونجی۔ یہ شاید وہی ہستی ہے جس نے ٹیلے پر میری مدد کی تھی۔

اس خیال نے مجھے تقویت دی اور میں بے خوف ہو گیا لیکن یہ بے خوفی زیادہ طویل ثابت نہ ہوئی کیوں کہ فوراً ہی مجھے ایسا لگا جیسے میں بادلوں پر سوار ہوں اور خلا کی بیکراں وسعت میں اڑا جا رہا ہوں' پھر یکایک ہی میری پرواز تھم گئی اور میں ایک کھنڈر کے آگے کھڑا تھا۔ اس کھنڈر کو دیکھتے ہی میرے دماغ میں تشبیہ گونجی۔ ''عالی شان کھنڈر۔''

واقعی وہ اپنے وقت میں نہایت اعلیٰ ایک شان دار قلعہ ہوگا۔ اس کی فصیل کے نشانات یہی بتا رہے تھے۔ میں ابھی جائزہ لے ہی رہا تھا کہ یک بہ یک اس کھنڈر کا نقشہ بدل گیا۔ ٹوٹی ہوئی دیواریں پھر سے کھڑی ہو گئیں۔ فصیل پر ٹہلتے ہوئے سپاہی نظر آنے لگے۔ پُرشکوہ دروازہ دکھائی دینے لگا پھر وہ دروازہ کھلتا چلا گیا۔ میں نے آنکھیں مل مل کر دیکھا کہ کہیں میں خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں مگر یہ خواب نہیں تھا حقیقت تھی۔ چاندنی چٹکی ہوئی تھی۔ اس لیے بھی وہ قلعہ بالکل صاف نظر آ رہا تھا۔ پتا نہیں کس احساس کے تحت میں آگے بڑھتا چلا گیا۔

ابھی میں نے بڑے دروازے کے اندر قدم رکھا ہی تھا کہ دو طرف سے بندوق کی نالی میرے سینے پر آ لگی۔ بندوقیں عجیب سی تھیں۔ میں نے کئی طرح کی بندوقیں دیکھ رکھی تھیں۔ دو نالی والی' ایک نالی والی' رَئفل' تھری ناٹ تھری اور بھی بہت طرح کی لیکن ایسی بندوق پہلی بار دیکھی تھی۔ اس بندوق کی نالی ڈیڑھ گز سے کم نہ تھی اس کی لمبائی کو نال پر لگی سنگین مزید بڑھا رہی تھیں۔ یکایک مجھے یاد آ گیا کہ اس قسم کی بندوقیں میں نے انگریزی فلموں میں دیکھی تھیں۔ یہ توڑے دار بندوق تھی جس میں گولیوں کی بجائے بارود بھرا جاتا تھا۔

میں رک گیا تھا تبھی کہیں دور سے ہوا کے دوش پر ایک سریلی آواز آئی۔ ''سپاہیو! اسے آنے دو۔ یہ میرا مہمان ہے۔''

سپاہیوں نے بندوقیں جھکا لیں اور مجھے آگے بڑھنے کا اشارہ دیا۔ سامنے مرغزار تھا۔

فوارے تھے' قسم قسم کے پھول تھے۔ گویا نہایت خوبصورت منظر تھا۔ میں اس چمن زار کے درمیان سے آگے بڑھتا رہا۔ ایسے جیسے مجھ پر سحر طاری ہو اور مجھے کوئی نادیدہ ہستی کھینچے لیے جا رہی ہو۔ چاندنی میں نہائے ہوئے منظر نے بھی اپنا سحر بنا رکھا تھا۔ ادھر سے اُدھر اڑتے ہوئے جگنوؤں کے غول اور بھی اچھے لگ رہے تھے۔ جلتے بجھتے قمقمے سے اڑتے دکھائی دے رہے تھے۔ میں دلچسپی سے اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا کہ سامنے ہی ایک محل نما عمارت نظر آئی۔ میں ادھر ہی بڑھتا جا رہا تھا کہ سامنے ایک کھلا ہوا دروازہ نظر آیا۔ مجھے سردی کا بھی احساس ہو رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے ہر جانب سرد ہوا کے جھونکے اٹھ اٹھ کر میرے جسم سے ٹکرا رہے ہوں۔ میں نے اسے پہاڑی علاقے کی مرطوب ہوا کی کارستانی سمجھا اور آگے بڑھتا رہا لیکن جیسے ہی دروازے کے اندر قدم رکھا ایک طرف سے چوبدار کے لباس میں ملبوس ایک شخص نمودار ہوا اور اس نے میرے سینے پر برچھا رکھ کر کہا۔ ''لوٹ جاؤ ورنہ یہ برچھا سینے کے پار ہو گا۔''

میں نے بھی مڑ جانا مناسب سمجھا اور مڑا ہی تھا کہ ایک مترنم آواز سنائی دی۔ یہ وہی آواز تھی جو مجھے مرکزی دروازے پر سنائی دی تھی۔ میں نے نظر اٹھا کر ادھر ہی دیکھا۔ زرد ساڑھی میں ملبوس ایک نہایت حسین لڑکی سیڑھیوں پر کھڑی تھی۔ اس کے کھلے ہوئے گھنے بال اتنے لمبے تھے کہ ایڑیوں کو چھو رہے تھے۔ کھلے ہوئے بالوں نے اس لڑکی کا حسن دوبالا کر دیا تھا' اس لڑکی نے چوبدار سے کہا تھا۔ ''انہیں مت روکو ادب سے پیش آؤ۔''

چوبدار نے میرے سینے پر سے برچھا ہٹا کر ادب سے سر جھکاتے ہوئے کہا۔

''جایئے' راج کماری جی آپ کی منتظر ہیں۔''

میں کسی کٹھ پتلی کی طرح آگے بڑھنے لگا پھر سیڑھیوں سے ہوتا ہوا اس لڑکی کے قریب پہنچ گیا۔

دیواروں پر بجا بجا قیمتی پتھر جڑے ہوئے تھے اور ہر پانچ ہاتھ کی دوری پر طاق بنے ہوئے تھے۔ طاقوں میں دیا جل رہا تھا۔ دیے کی روشنی ان پتھروں پر پڑ رہی تھی اور پتھروں سے منعکس روشنی نے پوری عمارت کو بقعۂ نور بنا رکھا تھا۔

جیسے ہی میں اوپر پہنچا' لڑکی نے ہاتھ بڑھا کر ایک طاقچے سے دیا اٹھا لیا اور اسے ہتھیلی پر رکھ کر آگے بڑھنے لگی۔ میں اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔

پتا نہیں کیوں میرے اندر کہیں بھی خوف کا شائبہ تک نہیں تھا۔ کچھ دور آگے جاتے ہی ایک راہداری سی نظر آئی جس میں دو رویہ کمرے بنے ہوئے تھے۔ ہر کمرے کے دروازے پر ایک لڑکی کھڑی تھی۔ ہر لڑکی دوسری سے زیادہ حسین لگ رہی تھی۔ ہر ایک کا حسن چاند کو شرماتا محسوس ہو رہا تھا۔ مگر ایک بات سب میں مشترک تھی۔ سب نے زرد ساڑھی پہن رکھی تھی اور سب کے سر احتراماً جھکے ہوئے تھے جیسے میں ان کے لیے نہایت اہم ہستی ہوں۔

میں ان پر سرسری نظریں ڈالتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا کہ آخری کمرے کے سامنے پہنچ کر میری ہمراہی رک گئی۔ اس نے سر جھکا کر نہایت ادب سے کہا۔ ''نربھے ہو کر جایئے۔ اندر راج کماری جی آپ کی پرتکشا کر رہی ہیں۔''

''راجکماری جی میرا انتظار کر رہی ہیں؟'' میں خود سے سوال کرتا ہوا اندر داخل ہوا۔

ایسا خواب صورت کمرا میں نے خواب میں بھی نہیں دیکھا تھا۔ یہاں سے وہاں تک ایرانی غالیچے بچھے ہوئے تھے۔ پورے کمرے کی آئینہ بندی کی گئی تھی جس کی وجہ سے وہ کمرا جگمگا اٹھا تھا۔ شمع دانوں میں شمعیں روشن تھیں۔ رنگین شیشوں سے چھن چھن کر آنے والی روشنیوں نے کمرے کے ماحول کو خواب ناک بنا دیا تھا۔ میں آگے بڑھتے بڑھتے ٹھٹک گیا۔ سامنے ایک چھپر کھٹ تھا' جس میں ہیرے موتی زمرد لعل و جواہر جڑے ہوئے تھے۔ فانوس کی روشنی ان پر پڑتے ہی منعکس ہو کر کمرے کو جگمگا رہی تھی۔ اس چھپر کھٹ پر ایک دوشیزہ گھٹنوں میں سر دیے بیٹھی تھی' بالکل گٹھری بنی' جیسے کوئی نئی نویلی دلہن ہو۔ میں اسے دیکھ ہی رہا تھا کہ اس نے جھکے ہوئے سر کو اٹھا دیا۔ اس کا حسن دیکھ کر میں سکتے میں رہ گیا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے فلک سے کوئی حور اتر آئی ہو۔

اس نے چھپر کھٹ سے نیچے قدم رکھا اور شرماتی لجاتی میری جانب بڑھنے لگی۔

☆======☆======☆

چھپر کھٹ پر بیٹھی سرخ گٹھری بنی لڑکی نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا اور میں سکتے میں آ گیا۔ اس حسن جہاں سوز سے میری آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ میں نے دنیا میں لاکھوں حسین چہرے دیکھے تھے۔ ان کی آنکھوں میں چھپے پیغام بھی پڑھے تھے۔ ان کی نگاہوں کو پیروں کی زنجیر بنتے بھی محسوس کیا تھا مگر کبھی اپنے دل پر اثر محسوس نہیں کیا تھا اور نہ کبھی کسی کو آگے بڑھنے کی ترغیب دی تھی۔ کراچی اور لاہور کی کتنی ہی لڑکیوں نے مجھ پر کمند ڈالنے کی کوشش کی تھی مگر میں نے حوصلہ شکنی کا رویہ اختیار کر کے انہیں آگے بڑھنے سے روک دیا تھا بلکہ جھڑک دیا تھا لیکن آج...... اس حسن کی ملکہ کو دیکھ کر میں ہوش گنوا بیٹھا تھا۔ کافی دیر تک اسے میں دیکھتا اور خدا کی صناعی کی داد دیتا رہا۔ مجھے سکتے کی کیفیت میں کھڑا دیکھ کر وہ چھپر کھٹ سے اتر کر میرے قریب آ گئی تھی پھر وہ جھکی اور میرے پیر چھو کر قدم بوسی کی پھر کھڑی ہو گئی تھی۔ میں اب تک بے خودی کے عالم میں کھڑا اسے ایک ٹک دیکھے جا رہا تھا۔

وہ مجھے ایک ٹک دیکھ رہی تھی مگر اس کی آنکھیں نمناک تھیں۔ پلکوں پر آنسو جھلملا رہے تھے۔ کچھ دیر تک وہ کسی مجسمے کی طرح ساکت کھڑی رہی پھر بولی۔ ''اپنے گلے میں بندھے کپڑے کو کھول کر رکھ دو۔''

پتا نہیں اس کی آواز میں ایسا کون سا سحر تھا کہ میں نے اپنے گلے میں لٹکتے تعویذ کو کھول کر الگ رکھ دیا پھر اس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔ وہ ہولے ہولے مسکرا رہی تھی اس نے میری طرف قدرے جھک کر کہا۔ ''جانتے ہو تم میں نے تمہیں کیوں بلایا ہے؟''

''کیوں؟''

''اس لیے کہ تم مجھے پسند ہو۔ تمہاری موہنی صورت میرے دل میں کھب کر رہ گئی

ہے۔''

''مگر تم ہو کون؟''

''میں راجا اندر پرست کی بیٹی ہوں۔ کوشلیا نام ہے میرا۔''

''مگر اب تو پورے ہندوستان میں کہیں کسی راجا کا وجود نہیں ہے۔''

''ہاں یہ بھی سچ ہے۔''

''تو پھر تم خود کو کیسے کسی راجا کی بیٹی کہہ رہی ہو؟''

''اس لیے کہ میں راجکماری ہوں' میرے پتاشری (باپ) راجا ہیں لیکن ہم اس دور کے کب ہیں' میرے پتاشری کا دیہانت (موت) ہوئے ڈھائی سو سال ہو گئے۔''

''آں...... پھر تم کیسے پیدا ہو گئیں؟ باپ کو مرے ڈھائی سو سال ہوئے اور تم بہ مشکل اٹھارہ بیس سال کی ہو؟''

''اٹھارہ بیس سال کی ہوں نہیں' نظر آ رہی ہوں۔ مجھے بھی مرے ہوئے اتنے ہی سال گزر چکے ہیں۔''

''تو کیا تم کوئی روح ہو؟''

''ہاں...... یہ جو یہاں اتنے سارے لوگ نظر آ رہے ہیں...... یہ داس داسیاں' سیوک اور سینک (سپاہی) سب کے سب مرے ہوئے ہیں۔ یہ سب ان کی آتمائیں (روحیں) ہیں جو میرے ساتھ مرے تھے اسی لیے اب تک میرے ساتھ ہیں۔''

اس حیران کن انکشاف پر مجھے بہت زیادہ حیرت نہ ہوئی کیوں کہ ایسا ہی کچھ میں نے سوچ رکھا تھا۔ جس قسم کے کپڑوں میں وہ لوگ نظر آ رہے تھے یہ آج کا فیشن نہ تھا اور نہ تلواروں کا اب زمانہ تھا۔ پھر بھی میں پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔ ''تم نے ابھی بتایا کہ تم مجھے پسند کرنے لگی ہو مگر میں تو زندہ انسان ہوں۔ زندہ انسان سے قربت حاصل کرنے کے لیے تمہیں جسم کی ضرورت ہو گی۔ ایسا ٹھوس جسم کہاں سے لاؤ گی؟''

''یہ بات صحیح ہے کہ تم سے ملنے کے لیے مجھے ٹھوس جسم کی ضرورت ہو گی مگر میں نے وصال کی خواہش تو کی نہیں ہے صرف رفاقت چاہی ہے۔ اسی لیے میں نے تمہارا ذہن پڑھا ہے اور تمہارے ہی لب و لہجہ میں بات کر رہی ہوں۔''

''رفاقت کی نوعیت کیا ہو گی؟''

"تم جس گورکھ دھندے میں پھنس چکے ہو اس سے نکالنے کی سعی کروں گی۔ ضرورت پڑی تو اس سے بھی آگے بڑھ کر بھرپور مدد دوں گی۔"

ہم ابھی باتیں کر ہی رہے تھے کہ ایسا لگا جیسے سب کچھ نظروں کا دھوکا ہو۔ ایک لمحے میں منظر بدل گیا۔

میں نے اطراف کا جائزہ لیا۔ اب نہ وہ محل تھا نہ وہ کمرا اور نہ وہاں کوئی حور شمائل لڑکی۔ میں اس ٹیلے پر کھڑا تھا جس پر نوگزا پیر کا مزار تھا۔ میری عقل جواب دے گئی تھی کہ یہ کیسا گورکھ دھندا ہے۔ اس ٹیلے سے نیچے اترا تھا اور میرے ساتھ اتنا کچھ گزر گیا مگر وقت وہیں کا وہیں تھما ہوا تھا۔ میں اسی جگہ کھڑا تھا۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ کہیں کوئی اور نہ تھا۔ علاقہ سنسان تھا۔ ہر طرف ویرانی کا راج تھا۔ ایسے وقت میں انسان اگر راستوں سے انجان ہو تو مزید پریشان ہو جاتا ہے کہ اب کدھر جائے؟ میں بھی اسی مخمصے میں تھا اور میں یہ سوچ رہا تھا کہ اب دھرم سنگھ کو کہاں تلاش کروں۔ تبھی مجھے ایسا لگا جیسے کوئی مجھ سے کہہ رہا ہو کہ سیدھے چلتے چلے جاؤ۔

اس خیال کے آتے ہی میں ناک کی سیدھ میں چلنے لگا۔ کچھ آگے چلنے کے بعد ایک پگڈنڈی سی نظر آئی اور میں پگڈنڈی پر بڑھتا چلا گیا۔ مزید کچھ آگے بڑھا تو مجھے دور ایک ٹیکسی کھڑی نظر آ گئی۔ میں نے اپنی رفتار تیز کر دی۔ جلدی جلدی اس ٹیکسی تک پہنچا۔ میرا اندازہ صحیح نکلا۔ وہ دھرم سنگھ کی ٹیکسی تھی۔ رانی بھی اس کے ساتھ تھی۔ وہ پچھلی سیٹ پر بے خبر سی پڑی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی دھرم سنگھ نے کہا۔ "اوئے یار تو کہاں تھا۔ جلدی بیٹھ۔"

میں نے اگلا دروازہ کھولا اور اس کے برابر میں بیٹھ گیا۔

"یہ تم نے عقل مندی کی ہے۔" وہی سرگوشی پھر سنائی دی۔ "بھاگلپور شہر یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔ بس تم چلتے جاؤ۔ دھرم سنگھ پر بھروسا رکھو یہ تمہاری رہنمائی کرے گا۔ اس کی تیسری آنکھ کھلنے والی ہے۔ اس سے دوستی بنائے رکھو۔" میرے کانوں کے پاس سرگوشی سنائی دی۔

اس سرگوشی نے مجھے بے چین کر دیا تھا۔ میں نے ہمت کر کے پوچھا۔ "یہ تیسری آنکھ کیا ہے؟ انسان کی تو صرف دو آنکھیں ہوتی ہیں۔"

"پیدا کرنے والے نے انسان کو دو نہیں تین آنکھیں دی ہیں۔ ہندو مائتھولوجی میں

ذکر ہے کہ شیو شنکر کو جب غصہ آتا ہے تو وہ تیسری آنکھ کھول دیتا ہے اور ہر طرف تباہی پھیل جاتی ہے۔ دراصل عام لوگ انسان کی تیسری آنکھ کے بارے میں نہیں جانتے ہیں۔ یہ فالتو آنکھ دماغ کے بالکل درمیان میں اور انتہائی گہرائی پر واقع ہوتی ہے اور ہمیں یہ آسانی دکھائی بھی نہیں دیتی۔" وہی سرگوشی سنائی دے رہی تھی۔ "ابتدا میں اسے ماہرین طب نے غدود قرار دیا تھا۔ اسی لیے اسے Pineal Gland کا نام دے دیا گیا۔ انسانوں میں اس آنکھ کا وزن 0.1 سے 0.2 گرام تک ہوتا ہے۔ اس میں وہ تمام چیزیں موجود ہیں جو انسانی آنکھوں میں ہوتی ہے۔ اس کے بیرونی حصے پر ایک شفاف Crystalline عدسہ (lens) ہوتا ہے اور اندر سے یہ ایک صاف و شفاف Tryansparent لعاب (Jelly) سے بھرا ہوتا ہے جسے Vitreous body کہتے ہیں اس کے علاوہ ایک نامکمل Rudamentary (پردہ بصارت) جس میں Light sensitive cell ہوتے ہیں اور ویسکولر ممبرین کے آثار بھی موجود ہوتے ہیں بالکل ایک عام آنکھ کی طرح۔ اس کے اپنے Nerves بھی ہوتے ہیں۔ ماہرین طب تو صرف اتنا کہتے ہیں کہ یہ تیسری آنکھ جسمانی رنگت کو کنٹرول کرتی ہے۔ جنسی تحریک میں اہم رول ادا کرتی ہے وغیرہ وغیرہ لیکن اصل کام کچھ اور ہے جو نہایت پُراسرار ہے۔ اسے ہر کوئی کام میں لاسکتا ہے اور پُراسرار قوت کا حامل بن سکتا ہے۔ مگر کیسے' یہ میں بعد میں بتاؤں گی۔ کیوں کہ ابھی یہ بتانا ہے کہ دھرم سنگھ کی بھی پُراسرار قوت بیدار ہونے والی ہے۔ جو نہایت پُراسرار ہے۔"

"وہ کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔ اس لیے پوچھا کہ آج سے صرف ایک ماہ پہلے تک نہ تو مجھے ایسی باتوں پر یقین تھا اور نہ میں اتنا کچھ جانتا تھا۔ تنتر منتر کی تو بات ہی دیگر ہے مجھے تو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ قرآن میں کیسی کیسی مخفی قوت چھپی ہے۔ جب کہ تلاوت بھی کرتا تھا۔

جس شخص کی زندگی میں ایسی محیرالعقول باتیں رونما ہونے لگیں اسے تو ہر بات پر یقین آنے لگتا ہے۔ میں نے اس پُراسرار سرگوشی پر بھی یقین کر لیا اور صرف تجسس فرو کرنے کے لیے پوچھا۔ "تمہارا نام کیا تھا؟"

"پرانی باتیں چھوڑو اور یہ بتاؤ کہ اب ارادہ کیا ہے؟"

"تمہیں کیوں بتاؤں؟"

"تو بھاڑ میں جاؤ۔" اس بار لہجہ بہت زیادہ جلا کٹا تھا۔ میں نے ذرا بھی توجہ نہ دی

اور دھرم سنگھ کی ٹیکسی پر نظر ڈالی۔ دھرم سنگھ آبدیدہ نگاہوں سے رانی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس قلیل عرصے میں کوئی مجھے بہت کچھ بتا گیا ہے اس کی اسے خبر ہی نہیں تھی۔ وہ تو بس ایک ٹک رانی کو دیکھے جا رہا تھا اور وہ اس طرح سے بیٹھی تھی جیسے سنگی مجسمہ۔ اس کی ویران آنکھیں کھڑکی کے پار افق پر جمی ہوئی تھیں۔ بال اس طرح سے بکھرے ہوئے تھے جیسے چڑیوں نے اس کے سر پر کئی ایک گھونسلے بنا رکھے ہوں۔ اسے اپنے کپڑوں کا بھی ہوش نہ تھا۔ میں دھرم سنگھ کے برابر میں بیٹھا ونڈ اسکرین سے باہر دیکھ رہا تھا۔ کبھی کبھی بیک ویو مرر میں رانی کو بھی دیکھ لیتا۔

دھرم سنگھ پوری رفتار سے ٹیکسی بھگاتا ہوا بھاگلپور کی طرف بڑھتا جا رہا تھا اس نے عادت کے مطابق اس شہر کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ''یہ ایک تاریخی شہر ہے۔ قبل مسیح سے آباد ہے۔ ہندوؤں کا تیرتھ استھان ہے۔ کہتے ہیں کئی سو سال پہلے یہاں ایک سوداگر ہوا کرتا تھا' نام اس کا چاندو سوداگر تھا۔ اس کی تجارتی کشتیاں اسی گنگا ندی کے ذریعے دور دور تک کا سفر کرتی تھیں۔ وہ بھگوان شنکر کا پجاری تھا۔ ایک دن جب وہ سفر سے لوٹا تو اس سے ملنے ایک عورت آئی......''

عورت کا ذکر سنتے ہیں میں نے پیچھے مڑ کر رانی کو دیکھا۔ وہ اب بھی اسی انداز میں بیٹھی تھی۔ پلکیں تک جھپکانا بھول گئی تھی۔ اسے یوں بیٹھا دیکھ کر ایک بار پھر میرے دل میں رحم کا جذبہ بیدار ہوا اور میں نے گہری سانس لے کر اپنا رخ موڑ لیا۔

دھرم سنگھ ڈرائیونگ کرتے ہوئے کہانی کہے جا رہا تھا۔ ''اس عورت نے اپنا پریچے (تعارف) یہ کہہ کر کرا دیا تھا کہ میں وشہری ہوں' سانپوں کی دیوی۔ تم میری پوجا نہیں کرتے ہو؟'' اس کے سوال پر چاندو سوداگر نے کہا کہ میں شنکر کی پوجا کرتا ہوں اس لیے تمہاری پوجا نہیں کر سکتا۔ اس جواب نے وشہری کے غصے کو تیز کر دیا۔ اس نے کہا اگر تم میری پوجا نہیں کرو گے تو میں تمہارا خاندان برباد کر دوں گی اور اس نے یکے بعد دیگرے اس کے چھ بیٹوں کو ڈس لیا۔ ساتواں بیٹا لچھمن دھر 'پالی' نامی ریاست میں رہ کر تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ اس لیے وہ بچ گیا۔ وقت گزرتا رہا اور لچھمن دھر جوان ہو گیا۔ اس کی شادی پڑوسی ریاست کی ایک نہایت خوب صورت لڑکی بیہولا سے طے پائی۔ وشہری نے آ کر چاندو سے پھر کہا کہ اب بھی وقت ہے تم میری پوجا کرو ورنہ یہ آخری چراغ بھی گل کر دوں گی مگر چاندو نہ مانا۔

تب وشہری نے کہا میں تمہارے اس بیٹے کو سہاگ کی سیج پر ڈسوں گی۔ چاندو نے بیٹے کے لیے لوہے کا گھر بنوایا جس میں اتنی سی بھی جگہ نہ تھی کہ دروازہ بند ہونے کے بعد سانپ اندر جاتا۔ جب آدھی رات ہوئی تو ایک ننھے سے سوراخ سے تجھک نامی سانپ اندر داخل ہوا اور میاں بیوی کے پلنگ کے پاس آ کر دم کے سہارے کھڑا ہو گیا۔ کہتے ہیں سانپ پلنگ پر چڑھ نہیں سکتا۔ وہ بھی اوپر چڑھنے کا راستہ ڈھونڈنے لگا تبھی اسے بیہولا کے کھلے بال دکھائی دے گئے جو پلنگ سے نیچے لٹک رہے تھے۔ تجھک ناگ انہی بالوں کے سہارے پلنگ پر چڑھ گیا۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ وہ ڈسے کیسے؟ سانپ اس وقت تک ڈستا نہیں جب تک اسے ستائے جانے کا خوف نہ ہو۔ وشہری نے مچھر کو حکم دیا کہ وہ جا کر لچھمن کو کاٹے۔ مچھر نے آ کر اس کے پیر پر کاٹا تو لچھمن نے نیند کی حالت میں پیر پٹخا۔ اس کی اس حرکت پر تجھک ناگ نے اسے ڈس لیا۔ جب وہ ڈس کر بھاگنے لگا تو بیہولا نے اپنے سہاگ کی نشانی سندور کی ڈبیا' کاجل کی کجلوٹی اور چندن یعنی صندل کی کٹوری اسے پھینک ماری کہ میرے سہاگ کے ساتھ یہ بھی لے جاؤ۔ تب سے تجھک کے بدن پر کالے سرخ اور پیلے چھینٹے نظر آنے لگے۔'' دھرم سنگھ نے کہانی ختم کر کے میری طرف دیکھا۔

''او بھائی سامنے دیکھ کر گاڑی چلاؤ۔'' میں نے جلدی سے ٹوکا۔

''او یارا! میں تے اکھاں بند کر کے گڈی چلاواں گا۔'' دھرم سنگھ کی پھرکی پھر گھوم گئی اور وہ اچھی خاصی صاف شفاف اردو بولتے بولتے پنجابی کا تڑکا لگی اردو بولنے لگا۔

میرے دل میں آیا کہ میں اس سے پوچھوں کہ سردار جی کیا بارہ بج گئے؟ مگر میرے پوچھنے سے پہلے ہی وہ اپنی ٹریک پر لوٹ آیا۔

''ہاں تو یارا' میں بیہولا لچھمن دھر کی کہانی سنا رہا تھا تو پتر! ہوا یوں کہ بیہولا نے لاش کو چتا میں جلانے سے انکار کر دیا۔ یوں بھی ہندو دھرم میں بچے کی لاش دفنائی جاتی ہے کیوں کہ وہ معصوم ہوتا ہے اس پر گناہ کی چھاپ نہیں لگی ہوتی جب کہ بڑے آدمی کی لاش کو آگ میں جلایا جاتا ہے تا کہ اس کے تمام گناہ جل جائیں لیکن جسے سانپ کاٹتا ہے اسے کیلے کے چار پانچ پیڑ کاٹ کر ایک دوسرے سے ملا کر باندھ دیتے ہیں پھر اس پر لاش رکھ کر گنگا میں بہا دیتے ہیں اس امید پر کہ شاید کوئی سپیرا اس کے زہر کو اتار دے۔

لچھمن دھر کی لاش کو کیلے کے پیڑ کے تنوں سے بنے ''بیلا'' پر رکھ کر بیہولا ساتھ بیٹھ گئی۔

لوگوں نے بیہولا کو پانی میں بہا دیا۔ کئی ماہ گزر گئے۔ بیلا بہتا رہا۔ بہتے بہتے گنگا ساگر پہنچ گیا۔ یعنی اس جگہ جہاں گنگا ندی سمندر سے ملتی ہے۔ سمندر بھگوان نے بیہولا کی قربانی کو' شوہر سے محبت کو دیکھتے ہوئے اسے اندر بھگوان کے پاس بھیج دیا۔ او باوا!'' دھرم سنگھ نے کہانی روک کر کہا۔ ''تو تو پاکستان سے آیا ہے تجھے ہندو دھرم کے بارے میں کیا پتا۔ سن یہ جو اندر بھگوان ہیں ناں یہ دیوتاؤں کے راجا ہیں۔ تمام دیوتا انہی کے درباری ہیں۔ خیر! سمندر بھگوان نے بیہولا کو اندر بھگوان کے پاس بھیج دیا۔ اندر بھگوان ناچ رنگ کے رسیا (شوقین) ہیں اسی لیے جس مرد کے اردگرد عورتوں کا جمگھٹا رہتا ہے اسے کہتے ہیں کہ اندر سبھا سجائی ہے' راجا اندر بنا ہوا ہے۔ راجا اندر نے بیہولا سے کہا کہ ناچ کر دکھاؤ اگر میں خوش ہو گیا تو تمہارے شوہر کو زندہ کر دوں گا۔ بیہولا نے ناچنا شروع کر دیا۔ صبح سے شام تک وہ ناچتی رہی بالآخر راجا اندر خوش ہو گئے اور انہوں نے وشہری کو بلا کر حکم دیا کہ وہ پچھمن دھر کا زہر چوس لے۔ وشہری نے کہا کہ پہلے چاندو سوداگر وعدہ کرے کہ میری پوجا کرے گا۔ چاندو نے بیٹے کی خاطر قبول کر لیا کہ میں پوجا کروں گا مگر الٹے ہاتھ سے۔ وشہری نے اسی پر اکتفا کر لیا اور پچھمن دھر کے بدن سے زہر چوس لیا تو یارا! یہ ہے اس علاقے کی مشہور لوک کتھا۔ بیہولا کا گھر آج بھی کھنڈر کی صورت میں باقی ہے۔ مزے دار بات یہ ہے کہ اس علاقے میں سانپوں کی بہتات ہے۔ اسی بہتات کی وجہ سے ایک بہت بڑے صوفی نے یہاں آ کر خانقاہ بنائی تھی جو آج بھی باقی ہے۔ اس خانقاہ کے دروازے پر ایک سیاہ پتھر ہے۔ جسے سانپ ڈس لیتا ہے اسے اس پتھر کو پھلانگنا پڑتا ہے۔ اگر وہ پتھر کو پھلانگ لے تو زہر اتر جاتا ہے۔ مولانا چک میں واقع اس خانقاہ میں مغل بادشاہ شاہ شجاع نے تعلیم حاصل کی تھی۔ اسی کے نام پر یہاں کا بازار شجاع گنج کہلاتا ہے۔'' دھرم سنگھ نے پوری تاریخ بیان کر دی تھی لیکن میں نے کچھ سنا اور کچھ نہیں کیوں کہ اس وقت بھی میرے ذہن میں بس ایک ہی خیال تھا کہ رانی کو کیسے اس سحر سے آزاد کراؤں۔ کاش میں یہاں آنے سے پہلے کسی عامل کامل کی شاگردی کر لیتا' کسی سے جادو سحر کا توڑ کرنا سیکھ لیتا' کوئی مخفی علم حاصل کر لیتا لیکن افسوس مجھے کب پتا تھا کہ کبھی میرا ٹکراؤ کسی ساحر' ٹونے ٹوٹکے والے سے ہوگا۔ اگر یہ سب کچھ میرے ساتھ نہ ہوا ہوتا تو میں ایسی محیر العقول باتوں پر یقین بھی نہ کرتا۔ آپ خود انصاف کریں۔ جیسے جیسے واقعات سے مجھے نمٹنا پڑا ایسی باتیں کیا آسانی سے یقین کرنے

والی ہیں؟

میں ابھی اسی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا کہ یکا یک ہی مجھے ایسا لگا جیسے میرے پیٹ میں مروڑ اٹھنے لگا ہے۔ میں نے ضبط کرنے کی کوشش شروع کر دی مگر انسان ہوں۔ انسان ہر چیز پر قادر ہے مگر جسمانی نظام کے کسی فعل میں دخل نہیں دے سکتا۔ اگر دخل دینے کی کسی نے کوشش کی تو پچھتاوا مقدر بن جاتا ہے۔ میرے بھی ضبط کا دامن چھوٹنے لگا۔ میں نے اردگرد کا جائزہ لیا۔ لہراتی' بل کھاتی سڑک بالکل سنسان تھی۔ سڑک کی دونوں طرف یا تو لہلہاتے کھیت تھے یا کھڈے اور گھاس کے میدان۔ جب ضبط کے انکار کی شدت بہت زیادہ بڑھ گئی تو میں نے سرگوشی میں دھرم سنگھ سے کہا۔'' کچھ دیر کے لیے گاڑی روک لینا۔''

''خیریت؟'' اس نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

''بس کچھ ضرورت ہے۔'' میں نے سر جھکا کر دھیرے سے کہا۔

''او اچھا!'' دھرم سنگھ نے مسکرا کر کہا۔ اور پھر ایک گھنے پیڑ کے سائے میں گاڑی کھڑی کر دی۔ جیسے ہی ٹیکسی رکی میں پھرتی سے دروازہ کھول کر نیچے اترا اور تقریباً دوڑتا ہوا ایک کھڈے میں اتر گیا۔ ابھی میں بیٹھا ہی تھا کہ دھرم سنگھ کی تیز آواز سنائی دی۔ وہ فراٹے سے گالیاں بک رہا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ اس کی ہنسی بھی سنائی دے رہی تھی۔ حیرت کی بات یہ ہوئی تھی کہ اترتے ہی میرے پیٹ کا مروڑ ختم ہو گیا تھا اس لیے میں فوراً ہی کھڈے سے باہر آ گیا۔ سڑک پر پہنچتے ہی میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ ٹیکسی کا دروازہ بند تھا۔ پچھلی سیٹ پر رانی اسی طرح بے سدھ پڑی تھی جب کہ دھرم سنگھ لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔ ہنس بھی رہا تھا اور گالیاں بھی بک رہا تھا۔ وہ ایسے مچل رہا تھا جیسے اسے کوئی گدگدی کر رہا ہو۔ مگر ٹیکسی میں ان دونوں کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ پہلے حیرت ہوئی مگر فوراً ہی دماغ نے سرزنش کی کہ بے وقوف اسے روک۔ یہ کوئی شیطانی چکر ہے' کوئی نادیدہ ہاتھ اسے گدگدا رہا ہے۔

اس خیال کے آتے ہی میں نے پھرتی سے تسبیح نکالی اور اسے آگے کرتے ہوئے بند شیشے پر دستک دی بس ایک لمحے میں حالات بدل گئے۔ پہلے اس کی ہنسی رکی پھر اس نے ایکسلیٹر پر دباؤ بڑھا دیا۔ کمان سے نکلے تیر کی طرح ٹیکسی بھاگتی چلی گئی۔ اب منظر کچھ ایسا تھا کہ ٹیکسی آگے تھی اور میں پیچھے پوری قوت سے دوڑ رہا تھا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ مجھے ستانے کی یہ چال ہے۔ صرف کچھ دیر کے لیے میں ٹیکسی سے اترا تھا کہ اس مخفی قوت نے دھرم سنگھ پر اپنا

قبضہ جما لیا۔ میں نے دور ہی سے اسم اعظم والی دعا پڑھنا شروع کر دی مگر پتا نہیں کیوں میں بار بار اس دعا کو بھول رہا تھا۔ صحیح الفاظ یاد نہیں آ رہے تھے۔ میں بدبداتا ہوا دوڑتا رہا۔ آبادی ابھی بھی دور تھی۔ میں نے حیرت سے اپنی داہنے جانب دیکھا۔ میری ہی رفتار سے وہ بلی بھی دوڑ رہی تھی۔ عام طور سے اس قبیل کے جانوروں میں اتنی تیزی نہیں ہوتی مگر وہ کمال پھرتی سے میرا مقابلہ کر رہی تھی ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ بلی میری پالتو ہے۔ اس کا رنگ بالکل سیاہ تھا۔ پہلی نظر میں وہ سیامی لگی مگر بغور دیکھنے سے یہ مغالطہ دور ہو گیا۔ وہ جسامت میں کچھ بڑی تھی مگر دیسی تھی۔ وہ دوڑتے ہوئے بار بار میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اب مجھے یقین ہو چلا تھا کہ وہ میرا ساتھ دے رہی ہے اسی لیے میری رفتار سے ہم آہنگ تھی۔

اس کی آنکھوں سے مجھے شعاعیں سی نکلتی محسوس ہوئی تھیں۔ یہ مغالطہ بھی ہو سکتا ہے اس لیے میں نے زیادہ توجہ نہ دی اور دھرم سنگھ کی ٹیکسی پر نظریں جمائے دوڑتا رہا۔ پتا نہیں میری رفتار بہت زیادہ تھی یا دھرم سنگھ نے ٹیکسی کی رفتار کم کر رکھی تھی کیوں کہ ہمارے درمیان یکساں دوری برقرار تھی پھر مجھے ایسا لگا جیسے کسی نے میرا ہاتھ تھام لیا ہو' سرد ہاتھ کا نشاط انگیز لمس پل بھر میں میرے پورے بدن میں سرایت کر گیا۔

میں نے لمس محسوس کرتے ہی داہنی جانب دیکھا اور حیرت سے اچھل پڑا کیوں کہ میرا ہاتھ تھامنے والی' وہی حسینہ تھی جس کے حسن کو الفاظ میں بیان کرنا ناممکن سی بات ہے۔ جس نے اپنا تعارف یہ کہہ کر کرایا تھا کہ وہ راجا اندر پرست کی بیٹی کوشلیا ہے۔ اس نے میرا ہاتھ کھینچتے ہوئے کہا۔ ''چلو پریتم چلو' چلتے رہو۔''

اس کی آواز اور لہجے میں ایسی سحر انگیز کشش تھی کہ خوف کے باوجود میرے قدم حرکت میں آ گئے۔ وہ مجھے لیے ہوئے ایک خستہ حال مقبرے میں داخل ہوئی مگر اندر آتے ہی وہاں ایک دم تاریکی پھیل گئی۔ میرے قدم رکے لیکن وہ نہ رکی۔ مجبوراً مجھے بھی چلنا پڑا۔ تاریکی میں مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں کسی ہموار فرش پر چل رہا ہوں۔ چند لمحوں بعد وہ بائیں جانب مڑ گئی۔ اس طرف قدرے ڈھلان تھی۔ ہم نشیب کی طرف جا رہے تھے۔ تقریباً پانچ منٹ بعد پھر ہمیں مڑنا پڑا۔ اس طرف چڑھائی کا سفر تھا۔ میرے ذہن پر عجیب سا خمار طاری تھا جس کے سبب میں کچھ سوچنے سے معذور تھا۔ پانچ چھ منٹ بعد وہ اچانک رک گئی۔ اس کے ساتھ ہی وہاں عجیب سی آوازیں ابھرنے لگیں۔ اس نے میرا ہاتھ چھوڑ

دیا۔ میں جلدی سے بولا۔ ''تم کہاں جا رہی ہو؟''

اسی لمحے وہاں دوبارہ روشنی پھیل گئی۔ میں نے جلدی سے ادھر اُدھر دیکھا اور حیران رہ گیا۔ وہاں دھوپ پھیلی ہوئی تھی اور سامنے ایک قدیم وضع کا محل تھا جس کا چوبی اور منقش پھاٹک بند تھا۔ باہر قدیم لباس میں نیزہ بردار سپاہی پہرہ دے رہے تھے۔ میں نے حیران و پریشان ہوتے ہوئے پلٹ کر دیکھا۔ مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر گہرائی میں ایک وسیع دریا بہہ رہا تھا اور ادھر سے دو نیزہ بردار سپاہی اسی طرف بڑھے چلے آ رہے تھے۔ البتہ وہ لڑکی کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ اسے موجود نہ پا کر میں خوفزدہ ہو گیا۔

دونوں سپاہی قریب آتے جا رہے تھے ان کے نصف چہرے' سر پر موجود آہنی ٹوپی میں چھپے ہوئے تھے اور پاؤں لمبے جوتوں میں پوشیدہ تھے۔ جلد ہی وہ میرے قریب آ کر رک گئے۔

''تم کون ہو اور یہاں کیا کر رہے ہو؟'' ایک سپاہی نے تحکمانہ لہجے میں پوچھا۔

اور مجھے یوں محسوس ہوا کہ میں ان کی زبان سے آشنا ہوں' میں خود بھی ان کی زبان میں بول سکتا ہوں۔

''میرا نام وجاہت علی خان ہے اور مجھے راجکماری جی یہاں لائی ہیں۔ یہ کس کا محل ہے؟''

''یہ راجا اندر پرست کا راج پرشاد (محل) ہے۔'' سپاہی نے جواب دیا۔

''تم شہزادی کے مہمان ہو تو جلدی اندر چلو۔'' دوسرے سپاہی نے کہا۔

میں محل کے دروازے کی طرف بڑھا اور وہ دونوں میرے آگے آگے قدم بڑھانے لگے۔

راجا اندر پرست کا نام سن کر مجھے حیرت ہوئی تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ راجکماری مجھے یہاں کیوں لائی ہے اور مجھے چھوڑ کر کہاں چلی گئی؟ میں جن پُراسرار حالات میں یہاں لایا گیا تھا ان کا خوف میرے ذہن پر ابھی تک چھایا ہوا تھا اور اب ایک اور اندیشہ میرے دل و دماغ پر ہتھوڑے برسا رہا تھا کہ سپاہی مجھے شہزادی کا مہمان سمجھ کر کیوں محل میں لے جا رہے ہیں۔

میں سپاہیوں کے ہمراہ محل کے پھاٹک پر پہنچا۔ وہاں کھڑے محافظوں کے جھکنے

ہوئے سر اوپر اٹھے اور میری طرف دیکھنے لگے مگر ان کے چہرے دیکھ کر میں خوف کے مارے اپنی جگہ ساکت ہو کر رہ گیا۔ وہ زندہ انسانوں کی بجائے ڈھانچوں کے چہرے تھے گوشت پوست سے محروم، مردہ کھوپڑیوں میں جیسے آنکھوں کی جگہ سوراخ تھے اور منہ کے دہانے میں لمبے لمبے سفید دانت نظر آرہے تھے۔ میں نے ان کے ہاتھوں اور پیروں کی طرف دیکھا۔ واقعی وہ انسانی ڈھانچے تھے مگر زندہ، متحرک۔

"دروازہ کھولو یہ راجکماری کوشلیا ہے تیتھی (مہمان) ہیں۔" میرے عقب میں کھڑے ایک سپاہی نے ان ڈھانچوں سے کہا۔

ان دونوں نے بڑھ کر محل کا دروازہ کھول دیا۔ سپاہیوں کی ہدایت پر میں محل کے سر سبز احاطے میں داخل ہوا، وسیع و عریض چمن زار میں جگہ جگہ فوارے نصب تھے۔ ہر طرف خوشنما مناظر تھے پھر بھی خوف سے میرے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ محل کے احاطے میں ابھی دو قدم ہی چلا تھا کہ اچانک عجیب سا شور بلند ہونے لگا۔ میں نے رک کر غور سے سنا اور خوف سے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ وہ شور بے شمار عورتوں کا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ کسی کی میت پر بین کر کے رو رہی ہوں۔

وہ پُراسرار آوازیں چاروں طرف سے آرہی تھیں میں نے پلٹ کر پیچھے آنے والے سپاہیوں کی طرف دیکھا تو وہ غائب تھے اور محل کا دروازہ بند ہو چکا تھا۔ شاید وہ باہر ہی رہ گئے تھے۔

دفعتاً پُراسرار آوازیں بند ہو گئیں اور وہاں ایک دم سناٹا چھا گیا۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا محل کے احاطے میں، میں تنہا کھڑا تھا۔ آس پاس کوئی ذی روح نظر نہیں آرہا تھا۔ جب کہ سامنے محل کی اصل عمارت تھی۔ اس کے برآمدے کے اندر یا باہر بھی کوئی نہ تھا۔

وہاں ابدی سکوت طاری تھا کہ اچانک کسی گھوڑے کے دوڑنے کی آواز بلند ہونے لگی اور وہ آواز لحہ بہ لحہ تیز ہوتی چلی جارہی تھی، لگتا تھا جیسے کوئی گھوڑا سیدھا میری طرف آرہا ہے۔ کوئی اسے دوڑائے لیے چلا آرہا ہے لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ دکھائی نہیں دے رہا تھا جلد ہی گھوڑے کی ٹاپیں میرے سامنے آکر رک گئیں۔

"رام سنگھ!" اچانک ایک گرجدار آواز بلند ہوئی اور میں ایک دم اپنی جگہ سہم گیا۔

"مہامانیا راج ادھی راج، سیوک اوپتیت ہے۔" (جہاں پناہ، بادشاہوں کے بادشاہ

غلام حاضر ہے) یہ آواز کسی اور کی تھی۔

"یہ مُسلا یہاں کیوں آیا ہے؟" پہلی آواز غضبناک تھی جس نے مجھے بھی غضبناک کر دیا تھا۔

متعصب ہندو مسلمانوں کو مُسلا کہہ کر ہتک آمیز انداز میں مخاطب کرتے تھے۔ ہم جو خداوند کریم کے پسندیدہ دین کے ماننے والے، اسے ایک کافر ہتک آمیز انداز میں مخاطب کرے، یہ مجھے کب پسند تھا اسی لیے غصہ آگیا تھا مگر حالات کو مدنظر رکھ کر خاموش رہ گیا کیوں کہ مقابل کون ہے اسے میں نہ پہچان پایا تھا اور نہ دیکھ پایا تھا۔ یہ کیسا گورکھ دھندا ہے یہ بھی جان نہیں پایا تھا۔

"مہاور! اسے راج کماری کوشلیا یہاں لائی ہیں۔" دوسری آواز نے جواب دیا۔ جسے رام سنگھ نام دیا گیا تھا۔

"اچھا! مگر وہ ہماری انومتی (اجازت) کے بغیر اس مُسلے کو یہاں کیوں لے آئی ہے۔" پہلی آواز نے پوچھا۔ اس کا لہجہ کچھ نرم ہو چکا تھا۔

"آپ شکار پر جنگل میں گئے ہوئے تھے اس لیے وہ......"

"مکھ بند!" پہلی آواز پھر زوردار ہو گئی۔ "کیا میں نے تمہیں اسی دن کے لیے مہامنتری (وزیراعظم) بنایا تھا کہ تم ہمارے شتروؤں کو ہماری راجیہ (سلطنت) کے اندر گھسنے دو۔"

"نہیں مہاراج!" رام سنگھ کی آواز لرز رہی تھی۔ "پرنتو (لیکن) راجکماری جی کو میں روکنے کا ساہس (جرأت) نہ کر سکا۔"

"تو ٹھیک ہے۔ اس مُسلے کو وہی سزا دو جو ہم اس سے پہلے بھی سنا چکے ہیں۔ اسے گنگا میں پھینک آؤ تا کہ گنگا کی مچھلیاں اور مگرمچھ میرے اپکار (سخاوت) سے فیضیاب ہوں۔"

اس کے ساتھ ہی گھوڑے کے ایک دم دوڑنے کی آواز سنائی دی جو بتدریج دور ہوتی چلی گئی۔

☆======☆======☆

میں خوف سے لرزتا ہوا گھوڑے کی ٹاپیں سن رہا تھا کہ اچانک مہامنتری کی آواز سنائی دی۔ "مہاراج ادھی راج کے آدیش کا پالن کرو۔" (جہاں پناہ کے حکم کی تعمیل کرو)

کچھ ٹھہر کر اس کی آواز پھر ابھری۔ ''اس مسلے کو ندی میں پھینک دو۔''

اگلے ہی لمحے مجھے اپنے دونوں بازوؤں پر پنجوں کی گرفت محسوس ہوئی۔ میں نے جلدی سے دائیں بائیں دیکھا اور خوف کی شدت سے میری چیخ نکل گئی۔ میرے دونوں طرف دو انسانی ڈھانچے کھڑے تھے اور میرے بازو ان ڈھانچوں کے استخوانی ہاتھوں کی گرفت میں تھے۔ ان کی گوشت پوست سے محروم انگلیاں میرے بازوؤں میں چبھ رہی تھیں۔ میں نے اپنے بازو ان کی گرفت سے آزاد کرانے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔

''چلو میاں جی گنگا کی لہریں تمہاری راہ دیکھ رہی ہیں۔'' ایک ڈھانچے نے ہنس کر کہا۔

اس کی ہنسی اتنی خوفناک تھی کہ میری سانس رکنے لگی۔ ہنسنے سے اس ڈھانچے کے لمبے دانت کھڑکھڑانے لگے تھے۔

''آؤ میاں جی گنگا میں رہنے والے جیو (جاندار) تمہارے خون سے پیاس اور گوشت سے بھوک مٹانے کے لیے بے تاب ہیں۔'' دوسرے نے میرا بازو کھینچا۔

وہ دونوں مجھے محل کے دروازے کی طرف کھینچنے لگے۔ میرا خوف سے برا حال تھا۔ پیروں میں جان نہ رہی تھی اور میں گھسٹتا ہوا چل رہا تھا۔

''رحم کرو بدبختو۔'' میں پھر چلایا لیکن اس بار ان میں سے کوئی نہ بولا۔ وہ مجھے گھسیٹتے ہوئے محل کے دروازے پر لائے تو باہر کھڑے محافظوں نے دروازہ کھول دیا۔

ڈھانچے مجھے باہر لائے اور سامنے نظر آنے والے دریا کی طرف بڑھنے لگے۔ دریا کے کنارے پہنچ کر وہ رک گئے۔ پھر ایک ڈھانچے نے میرے دونوں بازو اپنے پنجوں میں قابو کیے اور دوسرے نے میری ٹانگیں پکڑ لیں۔

''چھوڑ دو مجھے۔'' میں تڑپ کر چیخا۔

''ہم تمہیں چھوڑ رہے ہیں۔ اب یہ فریاد دریا کی مخلوق سے کرنا۔'' ایک ڈھانچے نے غصے سے کہا۔ پھر ان دونوں نے مجھے اوپر اٹھا کر جھولا دیا اور چھوڑ دیا۔ میں ان کی گرفت سے آزاد ہو کر سیدھا دریا کے پانی میں جا گرا اور اس کے ساتھ میرا ذہن تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔

☆======☆======☆

مجھے ہوش آیا تو میں ایک ایسی جگہ پڑا ہوا تھا جہاں ہر طرف پیڑ ہی پیڑ تھے۔ اگلے ہی لمحے میری یادداشت تازہ ہو گئی اور گزرے ہوئے پُراسرار واقعات میرے ذہن پر کسی فلم کی طرح چلنے لگے۔ ڈھانچوں کا تصور کرتے ہی مجھ پر خوف طاری ہو گیا۔ مجھے یہاں آنے کی کڑی سزا دی گئی تھی اور ڈھانچوں نے مجھے دریائے گنگا میں پھینک دیا تھا۔

''تمہیں ہوش آ گیا ہے؟'' دفعتاً عقب سے راجکماری کی مانوس اور شیریں آواز ابھری۔

''اوہ......!'' میں بے اختیار اچھل پڑا۔ ''تم' تم کہاں ہو راج کماری؟''

''مجھے افسوس ہے کہ تمہیں میری وجہ سے تکلیف اٹھانا پڑی۔'' راج کماری کی آواز سنائی دی۔

''مگر مجھے تو دریا میں پھینک دیا گیا تھا پھر میں کیسے بچ گیا؟ یہ کون سی جگہ ہے؟'' میں تیزی سے بولا۔

''یہ دریائی محل سے کافی دور راجا اندر پرست کی سلطنت سے باہر' تاریک جنگل ہے۔'' راجکماری نے جواب دیا۔ ''مجھے کافی دیر بعد خبر ملی کہ تمہیں دریا کے حوالے کر دیا گیا ہے۔ اس لیے میں بروقت پہنچ نہ سکی اور تم یہاں تک موجوں پر بہتے ہوئے پہنچ گئے۔''

''تو کیا تم نے مجھے دریا سے نکالا ہے؟'' میں چونکا۔

''ہاں لیکن اب تم چلنے کی تیاری کرو۔ تھوڑی دیر بعد صبح ہونے والی ہے۔ اگر کسی گزرنے والے جہاز سے تمہیں دیکھ لیا گیا تو راجا کو تمہارے زندہ بچ جانے کی خبر مل جائے گی اور اس کے سپاہی تمہیں ہلاک کرنے کے لیے آ جائیں گے۔''

''اب کہاں جانا ہے۔'' میں نے پریشان ہو کر پوچھا۔ ''میں واپس جانا چاہتا ہوں۔''

''صبر کرو۔ میں تمہیں جہاں کہو گے وہاں پہنچا دوں گی لیکن فی الحال یہ ممکن نہیں ہے۔ میرے سونے کا وقت ہو چکا ہے۔ اس لیے میں جا رہی ہوں۔ تم اس جنگل میں چلے جاؤ۔ وہاں تمہیں پناہ گاہ مل جائے گی۔ میری مجبوری ہے کہ میں دن کے اجالے میں تم سے نہیں مل سکتی۔ کل رات میں آؤں گی اور تمہیں لے جاؤں گی۔''

''اوہ......!'' میں اس کے جانے کی بات سن کر سٹپٹا گیا۔ ''جنگل میں سخت اندھیرا

ہے۔''

''تم آگے بڑھو۔روشنی مل جائے گی۔جنگل اتنا گھنا نہیں ہے۔پھر جلد ہی اجالا پھیلنے والا ہے۔''اس کی آواز سنائی دی۔

مجھے محسوس ہوا کہ شہزادی کی آواز چندفٹ کے فاصلے سے آرہی ہے۔میں نے راجا کی بھی صرف آواز سنی تھی اور مہامنتری کی بھی آوازیں سنائی دیتی رہی تھیں۔یہ یاد آتے ہی میں نے کہا:

''راج کماری! میں نے راجا اور مہامنتری کی محض آوازیں سنی تھیں۔وہ مجھے نظر کیوں نہ آئے تھے؟ آخر یہ کیا معاملہ ہے۔''

شہزادی کی ہنستی ہوئی آواز سنائی دی۔''باقی باتیں میں اگلی ملاقات میں بتاؤں گی۔ اگر میں مقررہ وقت پر مقبرے میں نہ پہنچی تو میری روح ہمیشہ کے لیے مرجائے گی۔اس لیے میں جارہی ہوں۔''

''ٹھہرو۔مجھے عذاب میں پھنسا کر تم مت جاؤ۔''میں نے تیزی سے کہا۔

لیکن شہزادی نے جواب نہ دیا۔اسی لمحے بلی کے رونے کی آواز آنے لگی اور میں چونک کر جنگل کی طرف دیکھنے لگا۔بلی کے رونے کی آواز بتدریج دور ہوتی جارہی تھی پھر وہ بالکل ہی معدوم ہوگئی۔

تنہائی کا احساس ہوتے ہی میں ایک بار پھر خوف میں مبتلا ہوگیا تھا کہ شہزادی کی ہدایت یاد آئی اور میں کھڑا ہوگیا۔شہزادی کا اندیشہ درست تھا کہ وہاں سے گزرنے والا کوئی بحری جہاز مجھے دیکھ کر راجا کو باخبر کردے گا۔چنانچہ میں درختوں کے جھنڈ میں گھس گیا۔ وہاں زیادہ تاریکی تھی۔میں احتیاط سے قدم اٹھانے لگا۔چند قدم چلنے کے بعد درختوں کے درمیان فاصلہ بڑھنے لگا جس کے سبب تاروں کی مدھم روشنی زمین پر پڑنے لگی اور مجھے چند قدم دور تک کی چیزیں دکھائی دینے لگیں میں اسی سمت میں آگے بڑھتا رہا مجھے نہ دھرم سنگھ یاد آرہا تھا اور نہ رانی میں گویا سب کچھ بھول چکا تھا یا پھر مجھے بھولنے پر مجبور کردیا گیا تھا۔

چند منٹ چلنے کے بعد مجھے سامنے کی سمت میں کسی چراغ کی لو نظر آنے لگی۔شاید اس طرف کوئی آبادی تھی۔میں چراغ کی لو پر نظر جمائے چلتا رہا لیکن اس چراغ تک پہنچنے سے پہلے ہی ایک دم آس پاس سے کئی پُراسرار آوازیں ابھرنے لگیں۔یوں لگتا تھا جیسے ہزاروں

بدروحیں اور چڑیلیں مل کر دانت کچکچا اور ہڈیاں چبارہی ہوں۔ان بھیانک آوازوں کو سن کر دہشت کے مارے میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔

☆======☆======☆

دانت کچکچانے اور ہڈیاں چبانے کی خوفناک آوازیں سن کر میں اپنی جگہ ساکت ہوکر رہ گیا۔میں نے اِدھر اُدھر دیکھا مگر تاریکی میں قریبی درختوں کے علاوہ کچھ نظر نہ آرہا تھا۔ خوف کی شدت سے میرا دل بری طرح دھڑک رہا تھا اور ٹانگیں کپکپارہی تھیں۔اچانک بائیں جانب آہٹ ہوئی۔میں نے ڈرتے ڈرتے اُدھر دیکھا اور دہشت سے میری سانس سینے میں اٹکنے لگی۔چندفٹ کے فاصلے پر تاریکی میں دو خوفناک آنکھیں چمک رہی تھیں۔وہ آنکھیں کسی بڑے جانور کی معلوم ہوتی تھیں اور ان سے بے پناہ درندگی جھلک رہی تھی۔

میں نے سہم کر اس طرف سے نگاہیں ہٹائیں اور داہنی طرف دیکھا لیکن اس طرف بھی وہ آنکھیں موجود تھیں۔میں نے گھبرا کر نگاہیں نیچی کرلیں۔اسی لمحے چڑیلوں کی بھیانک آوازیں ایک دم بند ہوگئیں اور کسی کے قدموں کی آہٹیں ابھرنے لگیں۔خشک پتوں کے چرچرانے کی آوازوں سے اندازہ ہوا کہ کوئی سامنے سے آرہا تھا۔میں نے سر اٹھا کر سامنے دیکھا مگر کچھ نہ دکھائی دیا۔پھر وہ آہٹیں چند قدم دور رک گئیں۔

''کیا آپ زندہ ہیں؟'' سامنے سے ایک سرد سی آواز سنائی دی۔''مجھے آپ کی رہنمائی کے لیے بھیجا گیا ہے۔''سرسراتی ہوئی وہی آواز دوبارہ گونجی۔

''تو پھر تم سامنے کیوں نہیں آرہے ہو۔''میں نے خوف پر قابو پر کر پوچھا۔

''یہ دنیا کئی حصوں میں منقسم ہے۔عام انسان یہی سمجھتا ہے کہ دنیا بس یہی ہے جو نظروں کے سامنے ہے۔مگر نہیں! اس کی وسعت اتنی نہیں ہے۔اس کے اتنے حصے ہیں جس کا شمار نہیں۔ایک دنیا زمین کے اوپر ہے جس میں تم انسان رہتے ہو۔ایک دنیا زمین کے نیچے ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی ننھی مخلوق رہتی ہے۔ایک دنیا سمندر کے نیچے ہے جہاں آبی مخلوق آباد ہے اور ایک دنیا ہوا میں ہے جس میں ہم آتشی مخلوق آباد ہیں۔'' وہی آواز سنائی دی۔''ہم تم انسانوں سے کم تر درجے کے ہیں مگر ہم میں کچھ ایسے عالم و دانشور بھی ہیں جن کے علم کے آگے انسان ہیچ ہے۔ایسے ہی ایک بزرگ سے پیر دمڑیا شاہ کی دوستی ہے۔کچھ آگے شہر ہے۔یہ بھاگلپور ہے۔یہ دراصل اولیائ کی سرزمین ہے۔پیر شاہ جنگی، شاہ حسین بابا

وغیرہ یہاں کے مربی ہیں۔''

''لیکن مجھ سے کسی کو کیا لینا دینا۔''

''پیر دمڑیا کو تم سے کوئی کام ہوگا اسی لیے انہوں نے تمہیں بلایا ہے اور دوستی کی بنیاد پر پیر صاحب نے ہمارے بزرگ سے کہا اور انہوں نے ہمیں بھیجا ہے۔''

''مگر کیوں؟''

''جب تک آپ علاقے کے حدود سے باہر ہیں شر کی قوت آپ کو گھیرنے کی کوشش کرے گی اسی لیے میں آیا ہوں' حفاظت کے لیے۔''

''میرا ساتھی دھرم سنگھ اور رانی کہاں ہے؟''

''مجھے پتا ہے' میں انہیں بھی بلوا رہا ہوں' اگر آپ ان کے پاس جانا چاہیں تو میں آپ کو ان کے پاس پہنچا سکتا ہوں۔'' اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ ہنوز نظروں سے اوجھل تھا صرف لمس سے احساس ہوا کہ اس نے میرا ہاتھ پکڑ رکھا ہے۔ اس احساس کے ساتھ دائیں بائیں سے گزرتی ہوئی تیز ہوائیں بھی محسوس ہوئیں۔ گویا مجھ سے بیس قدم کی دوری پر دھرم سنگھ رانی کے ساتھ بیٹھا تھا۔ شاید وہ دونوں آرام کرنے کی نیت سے بیٹھے تھے۔ کیوں کہ دونوں کی آنکھیں بند تھیں اور دونوں ہی نے پیڑ کے تنے سے ٹیک لگا رکھی تھی۔

''اچھا میں چلتا ہوں' کیوں کہ شام کا اندھیرا پھیلنے لگا ہے۔ مغرب و عشاء کی نماز میں باجماعت پڑھوں گا۔''

اس نے مصافحہ کیا پھر شاید وہ چلا گیا تھا۔ میں بھی دھرم سنگھ کی طرف بڑھنے لگا۔ نزدیک پہنچ کر میں نے آواز دی۔ میری آواز سنتے ہی اس نے کہا۔ ''او یار تو کہاں تھا؟''

''وہ میں بعد میں بتاؤں گا' پہلے یہ بتاؤ کہ تمہاری ٹیکسی کہاں گئی؟''

''اس میں خرابی ہوگئی تھی۔ میرا ایک واقف کار مل گیا۔ اس کے ذریعے میں نے اسے بھاگلپور بھیج دیا جب ہم وہاں پہنچیں گے تب تک ٹھیک ہو چکی ہوگی۔''

''اب کیا اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارو گے۔ ٹیکسی ہوتی تو کسی آبادی تک پہنچ جاتے۔''

''شہر اب دور ہی کتنا ہے چلو پیدل چلے چلتے ہیں۔ رانی کو ہم دونوں دو طرف سے سہارا دے لیتے ہیں۔'' دھرم سنگھ نے کہا۔

ہم دونوں نے دائیں بائیں سے اس کے بازو تھام لیے اور آگے بڑھتے چلے گئے۔ کافی دور ایک جھونپڑی نظر آ رہی تھی۔ ہم سب آگے پیچھے اس جھونپڑی تک پہنچے وہ ایک بڑی سی جھونپڑی تھی جس کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اندر بھی ملگجا اندھیرا تھا۔ دھرم سنگھ نے ماچس جلا کر روشنی کی۔ دروازے پر ہی ہمیں ایک لیمپ رکھا نظر آیا۔ ان علاقوں میں شرفا اپنے گھروں میں روشنی کے لیے فانوس' شمع دان وغیرہ استعمال کرتے تھے اور غربا لالٹین یا چراغ' انگریز اپنے ساتھ چراغ کی ایک نئی شکل لے کر آئے تھے جسے لیمپ کہا جاتا ہے۔ ویسا ہی لیمپ اس جھونپڑی میں نظر آیا تھا۔ سجاوٹ میں بھی انگریزیت کی جھلک تھی۔ شاید وہ جھونپڑی کسی سرکاری افسر کی تھی۔ اسے پار کرتے ہی آنگن تھا اور آنگن کے بعد ایک اور جھونپڑی تھی ہم اسی سمت بڑھتے چلے گئے۔ دھرم سنگھ نے لیمپ اٹھا کر ہلایا پھر بولا۔ ''اس میں تو تیل بھی ہے۔''

اس نے ماچس جلا کر لیمپ روشن کیا۔ یرقان زدہ روشنی جھونپڑی میں پھیل گئی۔ اس زرد روشنی میں ہم نے جھونپڑی کا جائزہ لیا۔ وہ اندر سے کافی کشادہ تھی۔ ایک جانب کتابیں وغیرہ بھی ہوئی تھیں۔ ایک کونے میں چولہا بھی بنا ہوا تھا۔ اس علاقے میں گھر کے اندر چولہے بھی کم بنائے جاتے تھے کیوں کہ دھوئیں کی نکاسی کا انتظام ہر گھر میں نہ تھا لیکن اس جھونپڑی میں چولہے کے نزدیک مٹی کی ہانڈیاں بھی رکھی ہوئی تھیں۔ میں نے ان ہانڈیوں کا جائزہ لیا۔ دو بڑی بڑی ہانڈیوں میں آٹا اور چاول جب کہ چھوٹی ہانڈیوں میں دال' نمک' مرچ' مسالے وغیرہ بھی تھے۔ ایک طرف بڑی سی صراحی اور کوزہ بھی تھا۔ دھرم سنگھ نے مٹکے سے مٹی کے کوزے میں پانی بھرا اور چکھنے کے بعد بولا۔ ''پانی بھی تازہ ہے۔ لگتا ہے' یہاں کوئی رہتا ہے۔''

''یہیں بیٹھ کر انتظار کرتے ہیں۔ مکین لوٹے گا تو اس سے پوچھ لیں گے۔'' میں نے کہا۔

ہم سب ایک کونے میں بچھی بید سے بنی ہوئی چٹائی پر بیٹھ گئے۔ پھر پتا نہیں کب ہماری آنکھوں میں نیند اتر آئی۔ میں بے خبر سو گیا پتا نہیں کتنی دیر تک میں سویا' جب آنکھ کھلی تو مجھے عجیب سا احساس ہوا۔ میں نے ایک نظر اپنے آس پاس ڈالی۔ وہاں دور دور تک کوئی نہ تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ میں شہر خموشاں میں پہنچ گیا ہوں۔ گھر میں پھیلی اتنی گہری خاموشی اور

گھر کے خالی پن نے پُراسراریت کی چھاپ لگا دی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہاں کے لوگ کہاں گئے۔ دھرم سنگھ اور رانی کہاں غائب ہیں؟ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ میں بستر سے نیچے اتر آیا تھا۔ میرا گلا خشک ہو رہا تھا۔ مجھے خوف تو نہیں مگر حیرت کا احساس ضرور تھا۔ میں نے پیروں میں سلیپر ڈالے اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا باہر نکلا۔ آنگن کے بیچوں بیچ چراغ دان سر اٹھائے کھڑا تھا۔ سبز رنگ کے اس کھمبے پر چوکور لالٹین جل رہی تھی۔ چراغ دان سے پھوٹتی یرقان زدہ روشنی نے ماحول کی پُراسراریت کو مزید بڑھا دیا تھا۔ آنگن کے مشرقی سمت دروازہ تھا۔

اس دروازے کے قریب بڑا سا پشتہ تھا جس پر چھوٹا سا چھپر تھا۔ اس چھپر کے نیچے دھرم سنگھ کا بستر تھا۔ وہ شراب کے نشے میں مست ہو کر وہیں پڑ گیا تھا۔ اس وقت بھی وہ سر سے پیر تک چادر اوڑھے سو رہا تھا۔ میں نے اسے آواز دی۔ سناٹے میں وہ آواز دور تک گونجتی چلی گئی مگر بازگشت کے علاوہ کوئی جواب نہ آیا۔ میں نے آگے بڑھ کر پھر پکارا لیکن وہی ڈھاک کے تین پات۔ خاموشی کے تالاب میں گھڑی بھر کے لیے گرداب اٹھے اور پھر وہی ہڈیوں میں اتر جانے والی گہری خاموشی' حیرت کی بات تھی کہ جھینگروں کی جھائیں جھائیں بھی سنائی نہیں دے رہی تھی جب کہ ایسے علاقوں میں رات کے پہلے پہر سے ہی یہ مکروہ آوازیں دماغ کی چولیں ہلانے لگتی تھیں اور آج ایسی گہری خاموشی۔ میں دو قدم اور آگے بڑھا۔ پھر پکارا۔ ''دھرم سنگھ۔''

وہی خاموشی' میں کچھ اور آگے بڑھا۔ غصے میں پائنتی کی طرف سے اس کی چادر کا کونا پکڑا ابھی کھینچنے کے لیے جھٹکا دینا ہی چاہتا تھا کہ اچھل پڑا۔ گہری خاموشی میں وہ مکروہ آواز گھڑیال کا گجر محسوس ہوئی۔ میں نے چونک کر ادھر دیکھا۔ چھت پر ایک سیاہ بلا کھڑا تھا۔ ستاروں کی دھندلی روشنی میں اس کا ہیولا بہت بھیانک نظر آ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں دہکتے ہوئے انگارے کی طرح چمک رہی تھیں۔ وہ مکروہ آواز میں رویا تھا۔

میری نگاہیں اس پر ٹک کر رہ گئیں تھیں۔ پتا نہیں' کیوں اس بلے کی آنکھوں میں ایسی کیا بات تھی کہ اپنے پتھرائے پیروں کو اٹھانے کی مجھ میں ذرا بھی قوت نہیں تھی۔

ابھی میں اسی کی طرف دیکھ رہا تھا کہ اس بلے نے ایک زوردار چیخ ماری اور اپنی جگہ سے اچھلا۔ مجھے ایسا لگا کہ اس نے مجھ پر چھلانگ لگائی ہے مگر نہیں وہ تو گویا ہوا میں تحلیل

ہو گیا تھا۔ میں حیرت سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے چھپر پر تلاش کرنے لگا۔ اس نے چھت سے چھلانگ لگائی تھی تو اسے چھپر پر ہونا چاہیے تھا۔ ہوا میں ایک ٹھوس وجود کیسے تحلیل ہو سکتا ہے؟ کافی دیر کی تلاش کے بعد بھی میری متلاشی نظروں کو مایوسی ملی تو میں چھپر کے نیچے سوئے ہوئے دھرم سنگھ کی طرف بڑھ گیا اور چادر کا کونا پکڑ کر زور سے کھینچا۔ چادر کھنچ کر نیچے سرک گئی۔ میں نے لاکھ کوشش کی مگر اپنے حلق سے نکلنے والی چیخ کو میں روک نہ سکا۔ مجھے اپنے ہاتھ پیر ٹھنڈے ہوتے محسوس ہوئے تھے۔

مجھ پر ہذیانی کیفیت طاری تھی۔ میں چاہ کر بھی اپنی چیخوں کو روک نہیں پا رہا تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ میری چیخیں سن کر بھی کوئی نہیں آیا تھا جب کہ وہ منظر ایسا تھا کہ میرا ہارٹ فیل بھی ہو سکتا تھا۔ دھرم سنگھ کی گردن کٹی ہوئی تھی جس سے خون ابل رہا تھا۔ سر کا پتا نہیں تھا۔ چیختے چیختے میرا گلا بیٹھنے لگا تو میں خود ہی تھک کر بیٹھ گیا۔

''کیا ہوا! تم یہاں کیوں بیٹھے ہو؟'' یہ آواز تھی یا خنجر' میرے حوصلے کو ٹکڑے ٹکڑے کر گئی۔ میں نے اٹھ کر بھاگنا چاہا تھا مگر میرے پیر تو جیسے من من بھر کے ہو گئے تھے۔ میں ہوش گنوا بیٹھا تھا کیوں کہ دھرم سنگھ کا دھڑ چادر پھینک کر بیٹھتے ہوئے سوال کر رہا تھا۔ بغیر سر کا دھڑ اٹھ کر چلنے لگا تھا وہ لالٹین کے نزدیک جا کر اس کی لو کو تیز کر رہا تھا۔ اب آنگن میں زرد روشنی یہاں سے وہاں تک پھیل گئی تھی۔

''کیا ہوا' بولتے کیوں نہیں ہو؟'' اس نے قریب آ کر پوچھا اور میں خوفزدہ ہو کر پھر سے چیخنے لگا۔ دھرم سنگھ ہی نے مجھے سنبھالا۔

''شاید تم خواب میں ڈر گئے ہو؟'' دھرم سنگھ نے میری پیٹھ تھپتھپا کر کہا۔

''شاید!'' اب میں اسے کیسے بتاتا کہ تمہارا گلا کٹا ہوا میں نے دیکھا۔ اگر بتا دیتا تو وہ اسے پیش گوئی سمجھ کر خوف زدہ ہو جاتا اور مجھے اکیلا چھوڑ کر بھاگ جاتا۔

جب ہوش قابو میں آئے تو میں ایک طرف بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بیٹھنے کے بعد میں نے کہا۔ ''مجھے تو بھوک لگ رہی ہے۔ کیوں نہ کھچڑی بنا لوں اس طرح ذہن بٹ جائے گا۔ خوف کا احساس بھی کم ہو جائے گا۔''

دھرم سے ماچس مانگ کر چولہا جلایا پھر کھچڑی چڑھا کر ایک جانب بیٹھ گیا۔ وقت گزرتا رہا۔ بیٹھے بیٹھے میں نے رانی پر نظر ڈالی۔ تھکن کے غلبے نے اسے بھی سلا دیا تھا۔

دھرم سنگھ بھی کمرے میں آ گیا تھا اور پھر اونگھ گیا تھا۔ میں نے ان پر سے توجہ ہٹا کر ہانڈی پر نظر ڈالی کھچڑی ابھی پکی نہیں تھی۔ میں نے لکڑی کی ڈوئی سے کھچڑی کو چلایا اور ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گیا ابھی زیادہ وقت نہ گزرا تھا کہ ایک عجیب واقعہ رونما ہوا۔

ہر طرف گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی اسی لیے وہ دھپ کی آواز سماعت شکن محسوس ہوئی تھی۔ میں نے مڑ کر دیکھا تھا اور میری چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی تھی۔ کسی انسان کا کٹا ہوا داہنا پیر گرا تھا۔ میں نے گھبرا کر چھت کی طرف دیکھا۔ پھوس سے بنا چھپر صحیح سلامت تھا۔ مٹی کی دیواریں بھی سلامت تھیں۔ کوئی روشن دان یا کھڑکی بھی نہ تھی جس سے وہ پیر اندر گرایا جا سکے۔ میں حیرت وخوف کے ملے جلے تاثر کے ساتھ ایک ٹک اسی پیر کو تکے جا رہا تھا۔

خوف تھا کہ ریڑھ کی ہڈی میں اترتا محسوس ہو رہا تھا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میرے ہاتھ پیروں سے کسی نے جان نکال لی ہو۔ پورا جسم مفلوج ہو کر رہ گیا تھا۔ ابھی میں ادھر ہی دیکھ رہا تھا کہ دوبارہ دھپ کی آواز ابھری۔ اس بار یہ آواز داہنی جانب سے آئی تھی۔ میں نے پھرتی سے مڑ کر ادھر دیکھا۔ دوسرا پیر اب گرا تھا۔ ان مناظر نے میرے حلق میں کانٹے سے اگا دیے تھے۔ میں چیخنا چاہتا تھا مگر آواز حلق میں اٹک کر رہ گئی تھی۔ تبھی ایک ہاتھ اور گرا پھر دوسرا۔ اب مجھ پر لرزا سا طاری ہو گیا تھا۔ دانت اس طرح بج رہے تھے جیسے پوری جھونپڑی سرد لہر کی لپیٹ میں آ گئی ہو۔ پھر دھپ کی زوردار آواز آئی اور دست و پا بریدہ دھڑ گرا۔

آپ میں سے کسی نے کبھی کٹی ہوئی لاش دیکھی ہے تو انہیں معلوم ہوگا کہ ایسا بھیانک منظر نظر آتا ہے تو خوف کی لہر پورے جسم میں دوڑ جاتی ہے اور اس منظر کو صحیح طور سے الفاظ میں بیان ہی نہیں کیا جا سکتا۔

میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ سینے کا پنجر توڑ کر باہر آ جائے گا۔ میرے دانت تک بجنے لگے تھے۔ اعضا کے گرنے سے بار بار دھمک پیدا ہو رہی تھی مگر رانی اور دھرم کے خراٹے ہنوز جاری و ساری تھے۔ ان کی نیند میں خلل ہی نہیں پڑا تھا۔ میں نے کھچڑی کی دیگچی اتار دی تھی۔ اب مجھ سے وہ کھچڑی کھائی نہیں جا رہی تھی۔ اگر کسی طرح کھا بھی لیتا تو متلی ہو جاتی۔ خوف نے آنکھیں بند کر لینے پر مجبور کر دیا تھا۔

میں آنکھیں بند کیے بیٹھا تھا کہ دھپ سے پھر کوئی چیز گری۔ میں نے آنکھیں کھول

کر دیکھا وہ کٹا ہوا سر تھا۔ اس سر میں جوگیوں کی طرح لمبے لمبے بال تھے۔ پیشانی پر تلک کا بڑا سا نشان تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے ابھی ابھی سندور سے قشقہ کھینچا گیا ہو۔ اس سے بڑی بات یہ تھی کہ اس کٹے ہوئے سر میں زندہ آنکھیں تھیں۔ اتنی چمکدار آنکھیں گویا سانپ کی ہوں۔ بالکل ویسی ہی کشش تھی۔ میں دم سادھے ادھر ہی دیکھ رہا تھا کہ اس نے آگے کی طرف کھسکنا شروع کر دیا' بالکل کچھوے کی طرح وہ دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہا تھا۔

ذرا ذہن میں تصور کریں' اس وقت میری کیا حالت ہوگی؟ گویا میں پتھر کا مجسمہ بن گیا تھا۔ ایک ٹک اسے دیکھے جا رہا تھا۔ اب وہ مجھ سے صرف دو ہاتھ کی دوری پر تھا۔ اس کی تیز نظریں میرا احاطہ کیے ہوئے تھیں۔ میں پلکیں تک جھپکانا بھول گیا تھا۔ اچانک سیٹی جیسی تیز آواز گونجی۔ میرا پورا جسم تھرتھرا اٹھا۔ اب کٹے ہوئے سر کے ہونٹوں سے تیز قہقہے پھوٹ رہے تھے۔ اس کے سفید سفید دانت بھی نظر آ رہے تھے۔ خوف نے میری نسوں میں پنجے گاڑ دیے تھے۔ میں سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ یہ سب کیا ہے۔ جس نے کبھی ایسا منظر دیکھا نہ ہو' اس کی حالت کیا ہوتی ہے اس کا اندازہ ہر کوئی لگا سکتا ہے۔ آج تک جو کچھ سنتا آیا تھا وہ کھلی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ دعائیں پوری ہوتی ہیں تو بددعائیں لگتی بھی ہیں۔ یہ سب ایسی باتیں ہیں جنہیں عقل سے ثابت کیا ہی نہیں جا سکتا۔ بڑی بوڑھیوں سے سنتا آیا تھا کہ آسیب وغیرہ بھی ہوتے ہیں۔ بھوت پلید' ارواح خبیثہ کا وجود ہے مگر کبھی دیکھا نہیں تھا اس لیے انہیں صرف قصہ کہانی سمجھتا تھا۔ اب تک کے حالات احساس دلا رہے تھے کہ اس دنیا میں کچھ پُراسرار طاقتیں بھی ہیں اور اس وقت کے منظر نے تو ٹھوس ثبوت مہیا کر دیے تھے۔

مجھے چاہیے تھا کہ ایسی حالت میں قرآنی آیات سے مدد لیتا' اپنے گرد اللہ کے کلام کا حصار قائم کر لیتا مگر اس وقت تو ذہن بھی منجمد ہو کر رہ گیا تھا۔ مجھے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا اور وہ موت کا ہرکارہ آہستہ آہستہ میرے قریب آتا جا رہا تھا۔

اب صرف ایک ہاتھ کی دوری رہ گئی تھی کہ دھرم سنگھ کی آنکھ کھل گئی۔ مجھے خوف کے عالم میں اس طرح بیٹھے دیکھ کر وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور لات اٹھا کر ایسی زوردار کک ماری کہ وہ ینگتا ہوا سرفٹ بال کی طرح اڑ گیا اور سیدھا جا کر دیوار سے ٹکرایا تھا۔ بھد کی زوردار آواز سنائی دی تھی۔ اس کے بعد جو کچھ رونما ہوا وہ ہماری روح فنا کر گیا۔ دھرم پر بھی خوف چھا گیا۔ اس وقت اس کی حالت قابل دید تھی۔ اس پر بھی لرزہ

طاری ہو گیا تھا صرف جسم میں ہی لرزش نہ تھی اس کے دانت بھی بج رہے تھے اور چہرہ اس طرح سفید پڑ گیا تھا جیسے کسی نے اس کے جسم سے لہو کا ایک ایک قطرہ نچوڑ لیا ہو۔ بات صرف اتنی تھی کہ دیوار سے ٹکراتے ہی وہ سر ناریل کی طرح بیچ سے پھٹ گیا تھا۔ وہ دو ٹکڑوں میں بٹ کر نیچے گرا تھا اور اس میں سے ایک ساتھ اچھل کر دو سر نکل آئے تھے۔ اب وہ دونوں دو طرف سے ہماری جانب بڑھ رہے تھے۔ ابھی ایک اور عقل کند کر دینے والا منظر منہ پھاڑے منتظر تھا۔ کٹے ہوئے ہاتھ پیروں میں گویا جان پڑ گئی تھی۔ پہلے دونوں پیر کھڑے ہوئے تھے پھر اس پر اچھل کر دھڑ جڑا تھا اور دونوں طرف دو ہاتھ' اب وہ بے سر کا دھڑ آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا۔ تین طرف سے حملہ آور تھے اور درمیان میں ہم۔ کٹے ہوئے سر دانت کٹکٹا کٹکٹا کر دو طرف سے بڑھتے آرہے تھے۔ ان کے حلقوں میں چمکتی ہوئی آنکھیں ایسے گردش کر رہی تھیں جیسے گھومتی ہوئی سرچ لائٹ۔

میں جو ہمیشہ سے بزدل رہا ہوں' یکا یک شیر بن گیا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے میرے اندر کوئی اور بھی ہے جو مجھے حوصلہ دے رہا ہے۔ اوسان بحال رکھنے کی ترغیب دے رہا ہے۔ میں نے فوراً ہی چولہے کے پاس رکھی جلانے والی ایک موٹی لکڑی اٹھالی۔ اس لکڑی کو پکڑ کر میں نے دونوں ہاتھوں میں تولا پھر آہستہ آہستہ داہنے جانب والے سر کی جانب بڑھا۔

رات کافی گہری ہو چکی تھی۔ ہر طرف اندھیرا تھا۔ کمرے میں پھیلی گہری سیاہی کو لیمپ کی زرد روشنی کچھ حد تک کم کر رہی تھی۔ ایسے نیم تاریک ماحول میں دور رینگتے ہوئے سر اور ایک چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا بغیر سر کا دھڑ پُراسراریت کو بڑھا رہا تھا۔ میں نے نزدیک پہنچتے ہی لکڑی کو بلند کیا تو رینگتا ہوا سر اپنی جگہ پر رک گیا۔ اس کی نظریں مجھ پر جم کر رہ گئی تھیں۔ ان نظروں میں غصے کے شعلے لپلپا رہے تھے۔ وہ کھا جانے والی نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا میں نے پوری قوت سے لکڑی کو گھمایا۔ مجھے ایسا لگا جیسے اس کٹے ہوئے سر کو سب کچھ پتا ہے یہاں تک کہ بچنے کا طریقہ بھی' وہ اچھل کر ایک جانب ہٹ گیا۔ لکڑی ہوا میں لہرا کر رہ گئی۔ میرے ہاتھوں میں ایک جھٹکا سا لگا۔ میں نے پھر وار کیا وہ دوبارہ اچھل کر مجھے غچا دے گیا۔

دونوں سر اس طرح اچھل رہے تھے جیسے موقع ملتے ہی مجھے ادھیڑ کر رکھ دیں گے۔ میں خود کو بچاتے ہوئے پاگلوں کی طرح لکڑی گھما رہا تھا لیکن اب تک ایک بھی سر زد پر نہیں

آیا تھا۔ میری طرح ان سروں اور دھڑ کا بھی انداز جارحانہ تھا۔ وہ اس طرح سے دانت پیس پیس کر حملہ آور ہوتے کہ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو وہ خوف ہی سے مر جاتا۔ میں ڈرا ہوا ضرور تھا مگر حالات کا تقاضا تھا کہ جان بچانے کے لیے شیر بنوں۔ اسی لیے میں بہادر بن گیا تھا۔

وہ دونوں بریدہ سر عجیب سی آواز نکالتے ہوئے میری طرف اچھلتے' سر بریدہ دھڑ مکے چلاتا اور میں خود کو بچا کر لکڑی گھما دیتا۔ یہی عالم دھرم سنگھ کا تھا وہ بھی زور شور سے مقابلہ کر رہا تھا۔ اس اچھل کود کے درمیان میں' میں زور سے بولا۔ ''بسم اللہ الرحمن الرحیم' **اللہ لا الہ الا ھوالحی القیوم**'' جیسے ہی میں نے آیت الکرسی شروع کی تو ایسا لگا جیسے ان سروں پر کسی نے پیٹرول چھڑک کر آگ دکھا دی ہو۔ یہی حالت سر بریدہ جسم کی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے دونوں سر اور دو پیروں پر چلتا' مکے برساتا دھڑ جل کر راکھ ہو گیا۔

دونوں سر کیا جلے' ایسا لگا جیسے نگاہوں کے سامنے سے دیوار ہٹ گئی۔ یقین کریں' اس میں رتی بھر بھی جھوٹ نہیں ہے۔ وہ جنگل' ویران مکان سب کچھ غائب ہو گیا۔ ہم سڑک کے کنارے اگی جھاڑیوں کے درمیان کھڑے تھے۔ مسجد اور چڑھائی کے درمیان جو تھوڑا سا غیر آباد علاقہ تھا' ہم وہیں کھڑے تھے۔ رات بھی کوئی زیادہ نہیں ہوئی تھی۔ پل کے علاقے میں اب بھی رونق نظر آرہی تھی لوگ باگ آجا رہے تھے۔

ہم تینوں نے پھر چلنا شروع کر دیا۔ تاکہ کہیں سر چھپانے کی جگہ مل جائے اسی تلاش میں ہم آگے بڑھتے رہے۔ آہستہ آہستہ رات گہری ہوتی جا رہی تھی۔ ہم قصبے سے نزدیک ہوتے جا رہے تھے۔ شاید یہ قصبہ ہندوؤں کا تھا کیوں کہ قصبے کے درمیان مندر کا کلس دکھائی دے رہا تھا۔ نہایت اعلیٰ شان مندر تھا تبھی تو اس کا کلس اتنا اونچا تھا۔ میں نے دھرم سنگھ سے پوچھا۔ ''یہ کون سی جگہ ہے؟''

''کیا کہا؟'' دھرم سنگھ نے چونک کر پوچھا۔ شاید وہ کسی خیال میں ڈوبا ہوا تھا۔ تبھی تو میری بات سن نہیں پایا تھا۔

''میں نے پوچھا تھا کہ اس قصبے کا کیا نام ہے؟''

''ناتھ نگر...... ہندو اور مسلم دونوں کی آبادی ہے۔ پہلے ہندوؤں کا علاقہ ہے پھر مسلمانوں کا۔''

''رات گزارنے کے لیے کوئی جگہ ڈھونڈو یا پھر سیدھے شہر چلو۔''

"رات کے وقت یہاں سے ٹم ٹم (یکہ) ملنا مشکل ہے اس لیے رات اسی قصبے میں گزارنا پڑے گی۔"

"تم ذرا تیز تیز جاؤ ٹھہرنے کی جگہ تلاش کرو۔ میں رانی کو لے کر آتا ہوں۔"

دھرم سنگھ آگے بڑھ گیا۔ ابھی وہ کچھ ہی دور گیا تھا کہ سامنے سے آتے ایک آدمی نے اسے روک لیا۔ دونوں میں کچھ باتیں ہوئیں اور وہ پلٹ آیا۔ اس نے کہا۔ "ان صاحب کا گھر نزدیک میں ہے اور یہ ہمیں اپنے ہاں ٹھہرانے پر راضی ہو گئے ہیں مگر تم کم بولنا تا کہ اندازہ نہ ہو سکے کہ تم مسلمان ہو۔"

میں نے انہی ایامِ مصیبت کے دوران میں جان لیا تھا کہ یہاں کے لوگ بہت زیادہ متعصب ہیں۔ کسی بھی مسلمان کو اپنے ہاں نہ تو ٹھہراتے ہیں اور نہ اپنے دستر خوان پر بٹھاتے ہیں۔

اس شخص کا گھر پہلی ہی گلی میں تھا۔ ہم تینوں آگے پیچھے داخل ہوئے۔

وہ ایک بڑا سا کمرا تھا۔ اس کمرے کا ایک دروازہ اندر آنگن میں کھلتا تھا۔ وہ ہمیں لے کر آنگن میں پہنچا۔ وہاں کا منظر دیکھتے ہی میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ آنگن کے بیچوں بیچ ایک چبوترا تھا۔ اس چبوترے کے سامنے مندر کا پجاری شیام کھڑا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ تھی۔ اس نے میری طرف دیکھ کر کہا۔ "سواگتم سواگتم" (خوش آمدید)

میں نے جواب میں سخت الفاظ کہنے چاہے تھے کہ دماغ سن ہو گیا اور زبان پتھرا گئی۔ شاید یہی حال دھرم سنگھ کا تھا کیوں کہ وہ بھی پتھر کا مجسمہ بنا کھڑا تھا۔ شاید یہ بھی شیام کی بدمعاشی تھی۔ اسی نے کوئی منتر پڑھ کر ہمیں مفلوج بنا دیا تھا۔ ہماری اس لاچاری کا فائدہ اٹھا کر ساتھ آنے والے شخص نے رانی کو کھینچ کر ہم سے الگ کیا۔ وہ تو پہلے ہی نیم مردہ سی تھی۔ لڑکھڑاتی چال سے گھسٹتی ہوئی چل پڑی۔ اس شخص نے اسے لے جا کر چبوترے پر لٹا دیا۔

شیام کی مٹھی میں ریت جیسی کوئی چیز تھی جس سے روشنی پھوٹ رہی تھی۔ ہلکی نیلی روشنی۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ روشنی آنکھوں کے راستے جسم میں داخل ہو رہی ہے۔ شاید یہ اسی کا کمال تھا کہ ہم بندھ کر رہ گئے تھے۔ قوت سامعہ اور بصارت کام کر رہی تھی۔ مگر قوت متحرکہ نے دم توڑ دیا تھا۔ ہم چاہ کر بھی ہم اپنی جگہ سے ہل نہیں پا رہے تھے۔

میری نظریں شیام پر لگی ہوئی تھیں۔ اس نے کہیں سے تین بڑی بڑی سیاہ موم بتیاں

نکالیں اور انہیں جلا کر اس چبوترے پر جما دیا پھر وہیں رکھے ایک بڑے سے پیتل کے اگردان میں عود، عنبر اور لوبان ڈال کر جلا دیا۔ پورا آنگن دھوئیں اور خوشبو سے بھر گیا۔ اس کے بعد شیام چبوترے کے قریب جا کر بیٹھ گیا۔

وہ آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا اور اس کے ہونٹ ہل رہے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کچھ پڑھ رہا ہو۔ بس دو چار منٹ گزرے ہوں گے کہ رانی نے چیخنا شروع کر دیا۔ وہ اس طرح تڑپ رہی تھی جیسے اس کے گلے میں کند چھری چل رہی ہو۔ دھرم سنگھ بپھرا اٹھا تھا اور اس کے بپھرا اٹھنے کی خبر اس کی آنکھیں دے رہی تھیں۔ مگر وہ بھی میری طرح مجبور بن چکا تھا اسی لیے خونخواری سے دیکھے جا رہا تھا اور آنکھوں کی سرخی بڑھتی جا رہی تھی۔

☆======☆======☆

میرے ہاتھ پیروں کو اس نے نادیدہ ڈور سے باندھ دیا تھا اور مجھے اس بندھن کو کاٹنے کا طریقہ بھی معلوم نہ تھا۔ میں جانتا تھا کہ یہ بندھن اب اسی طرح کٹ سکتا ہے کہ مرغ بانگ دے۔ زمانہ قدیم سے یہ عقیدہ چلا آ رہا ہے کہ جیسے ہی مرغ بانگ دیتا ہے، تمام کالے علم کے اثرات زائل ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سکھ مذہب کے پیروکار اذان جیسی مقدس آواز کو بھی بانگ کہتے ہیں کیوں کہ اذان کی آواز میں بھی جادو ٹونے کے اثر کو زائل کرنے کی قوت ہوتی ہے۔

آج بھی پنجاب کے ہندو اور سکھ کالے علوم کے ماہروں کی پھیلائی ہوئی اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ اذان اپنے اندر ایسا زبردست اثر رکھتی ہے کہ اس آواز کی گونج ہر قسم کے منتروں کو بے اثر کر دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ادھر اذان شروع ہوتی ہے اور ادھر سکھ عورتیں پیالہ، پلیٹ، کٹورا اور چمٹا بجانا شروع کر دیتی ہیں تا کہ اذان کی آواز دب جائے۔

اب مجھے انتظار تھا کہ کب اذان شروع ہوتی ہے۔ میں ابھی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا کہ دھرم سنگھ کی آواز نے چونکا دیا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "یارا، کچھ کرو، تمہارے دھرم کی اتنی پوتر گرہنت (مقدس کتاب) ہے اس میں سے کچھ پڑھو۔"

"اف خدایا یہ کیا۔" اس کے سوال کا جواب دینے کی بجائے میں زیر لب بڑبڑایا۔

"دھرم سنگھ کیا آپ محسوس کر رہے ہیں کہ عجیب سی پُراسراری ٹھنڈک بڑھتی جا رہی ہے۔"

"ہاں یارا، یہی میں بھی محسوس کر رہا ہوں۔" دھرم سنگھ نے کہا۔

"ارے ادھر دیکھو۔" میں نے دھرم سنگھ کی توجہ شیام کی طرف دلائی۔ شیام کی گود میں ایک چھوٹی سی مورتی تھی۔ ہندوؤں کے پتا نہیں کتنے بھگوان' کتنی دیویاں ہیں۔ یہاں آنے سے پہلے میں نے کسی ایک کا بھی نام نہیں سنا تھا مگر یہاں آتے ہی جن لوگوں سے ٹکراؤ ہوا انہوں نے نادانستہ طور پر اپنے کئی دیوی دیوتاؤں کے بارے میں معلومات فراہم کر دیں۔ شیام کی گود میں جو مورتی تھی وہ بہ مشکل ایک فٹ کی تھی بالکل پلاسٹک کی گڑیا جیسی مگر اس وقت وہ غیر محسوس طریقے پر اپنی ہیئت تبدیل کر رہی تھی۔ اس کی رنگت دھیرے دھیرے خاکستری ہوتی جا رہی تھی۔ اس کا سر بھی تیزی سے تبدیل ہو کر عجیب و غریب شکل اختیار کرتا جا رہا تھا۔

"واہے گرو دی سوں! یہ تو جیویت (زندہ) ہوتی جا رہی ہے۔" دھرم سنگھ بڑبڑایا۔

"میں سمجھ گیا کہ یہ اگر دان میں کیکر کے کانٹے' سیب کے پتے' رال' تارکول اور ایسی ہی دوسری پردوشن (آلودگی) پیدا کرنے والی سامگری (چیزیں) جلا رہے ہیں۔ ان میں کچھ ایسی سامگری بھی ہیں جو اوتے جنا (جذبات میں ہیجان) پیدا کرتی ہیں۔ یہ اسی کا کمال ہے۔"

"دھرم سنگھ! آخر یہ کرنا کیا چاہتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"واہے گرو کرپا کرے' میری شکتی واپس مل جائے تو میں اسے بتاؤں میری رانی میرے لیے کتنی قیمتی ہے۔"

"ارے بھئی مجھے بھی تو بتاؤ یہ کرنا کیا چاہتا ہے؟"

"یہ انسانی قربانی دینے کی تیاری کر رہا ہے۔"

"کیا...... یہ رانی کی قربانی دے گا؟"

"ہو سکتا ہے اس کی بجائے ہماری قربانی دینا چاہتا ہو۔"

"نہیں یہ اتنا ظالم تو نہیں ہوگا کہ ہمارا خون کر دے۔"

"تم کس دنیا میں ہو۔ قربانی کا دستور تو پراچین کال (زمانہ قدیم) سے ہے۔ یہ شیطان فطرت شخص ہماری قربانی دے کر خوش ہوگا۔ اس کے علاوہ خون کی قربانی تو بھگوان کو پرسن (خوش) کرتی ہے۔"

"یہ سب زمانہ قدیم کی باتیں ہیں۔ اب انسان کی قربانی کون دیتا ہے۔"

"او یار! تُو پاکستان سے آیا ہے نا! تجھے دھرم کرم کی باتیں' کہاں پتا' اس بات کو اس طرح سمجھنے کی کوشش کر کہ خون زندگی ہے خواہ انسانی ہو یا جانور کا' اسے جب بہایا جاتا ہے تو اس سے ایک نظر نہ آنے والی شکتی ہر طرف فضا میں پھیل جاتی ہے۔ اب اگر خاص تیاریوں کے ساتھ محدود حلقے میں یہ توانائی خارج ہو تو اسے گرفت میں لے کر اپنے مطلب کی دشا (سمت) میں موڑا جا سکتا ہے جیسے بجلی کو جب جیسے چاہا جس چیز کے لیے چاہا استعمال کیا۔"

"پھر بھی میرا دل نہیں مانتا کہ یہ انسانی قربانی دیں گے۔"

"یہ اس بات پر آدھاریت (منحصر) ہے کہ وہ اس قربانی سے کیسا فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔ اگر یہ کسی خاص آدمی کو تباہ کرنا چاہتا ہے تو اسے کنوارے مینڈھے کی قربانی دینی ہوگی اور اگر یہ کسی خاص آدمی میں نفسانی جذبات بھڑکانا چاہتا ہے' کسی مرد یا عورت کو غلط راستے پر ڈالنا چاہتا ہے تو اس کا نام لے کر بکرا قربان کرے گا مگر انسان کی قربانی ہر مقصد کو پورا کرتی ہے اور بہت زیادہ موثر ثابت ہوتی ہے۔ قربانی سے پہلے ہمیں کچھ کرنا ہوگا۔ تم اپنے دھرم کا کوئی اشلوک (آیت) پڑھو نا۔"

دھرم سنگھ کے کہتے ہی میں نے سورہ توحید کی تلاوت شروع کر دی۔ یہ میرے مالک کا فیض ہے کہ اس نے اپنے کلام میں میرے لیے قوت بھر دی۔ چوتھی بار قُل پڑھتے ہی میرے اعصاب میں جان پیدا ہو گئی۔

میں نے قُل پڑھ کر دھرم سنگھ پر بھی پھونک ماری۔

"اوئے شہزادے! تُو بھی تانترک ہے کیا؟ میں آزاد ہو گیا۔ لے دیکھ ہاتھ پیر ہل رہے ہیں۔" کہہ کر دھرم سنگھ نے مجھے ایک دھول جما دی۔

"اب یہ سوچو کہ کرنا کیا ہے۔" میں نے کہا۔

"روشنی پھیلنے کا انتظار کرنا ہے کیوں کہ روشنی پھیلتے ہی جادو کا اثر ختم ہو جائے گا۔"

"روشنی...... تو کیوں نہ روشنی پیدا کی جائے۔ میرے پاس ٹارچ ہے نا!"

"تجربہ کر کے دیکھ لو۔ شیام کی گود میں جو مورتی ہے اس کے چہرے پر روشنی ڈالو۔" دھرم سنگھ نے مشورہ دیا۔

اب میں نے اپنا رخ بدل لیا اور دھیرے دھیرے شیام کے نزدیک ہونے لگا۔ جیسے جیسے ہم قریب پہنچ رہے تھے۔ سردی کا احساس بڑھتا جا رہا تھا۔ مجھے یقین ہو چلا تھا کہ یہ دُ

لہر اس دیوی کا کرشمہ ہے کیوں کہ گرمی نور کا مخرج ہے اور سردی ظلمت کا۔ ہمیں یہ بھی ڈر تھا کہ کہیں وہ پہل نہ کر دے۔ اگر اس نے وار کر دیا تو ہم بری طرح شکست کھا جائیں گے۔

اب ہم چبوترے کے بالکل قریب پہنچ چکے تھے۔ شیام کی آنکھیں ہنوز بند تھیں۔ وہ مورتی کو گود میں بٹھائے کچھ پڑھنے میں مشغول تھا۔ تبھی دھرم نے کہا۔ ''بٹن دباؤ۔''

میں نے ٹارچ کو کمر سے کھینچا اور مورتی کے چہرے کی طرف کر کے بٹن دبا دیا۔ روشنی کا جھماکا ہوتے ہی زوردار چیخ سنائی دی۔ اب یہ پتا نہیں کہ یہ چیخ کس کی تھی۔ شیام کی یا اس مورتی کی جو بے جان تھی مگر میں نے اس میں جان پڑتے بھی دیکھی تھی۔

چیخ کے ساتھ مورتی کا وجود ناپید ہو گیا۔ وہ ایسے غائب ہو گئی تھی جیسے کبھی تھی ہی نہیں۔

اتنی دیر میں ہم چبوترے کے اس طرف پہنچ گئے تھے جہاں رانی لیٹی ہوئی تھی۔ دھرم سنگھ نے اسے اٹھا کر کندھے پر لاد لیا تھا۔ اس نے واپسی کے لیے مڑتے ہوئے کہا۔ ''جتنی تیز بھاگ سکتے ہو بھاگو۔ سڑک کی جانب دوڑنا۔''

میں نے پوری قوت سے دوڑنا شروع کر دیا۔

پتا نہیں یہ ماحول کا اثر تھا یا میں حد سے زیادہ گھبرا گیا تھا۔ کیوں کہ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

ہم نے کافی فاصلہ طے کیا تھا مگر ابھی تک سڑک نظر نہیں آئی تھی۔ بڑی سڑک پتا نہیں کہاں کھو گئی تھی۔

''لگتا ہے اس کم بخت شیام نے سحر کا پردہ کھینچ دیا ہے۔ سڑک اور ہمارے درمیان میں ایک نادیدہ پردہ کھنچ گیا ہے۔'' میں نے کہا۔

''کچھ بھی ہو بھاگتے رہو۔ میں گرو وانی (سکھوں کی مقدس کتاب (گرنتھ صاحب، کے اشلوک) پڑھ رہا ہوں تم کلام ربانی پڑھو۔ کامیابی ضرور ملے گی۔'' دھرم بولا۔

واقعی آیت الکرسی کا ورد کرتے ہی گویا نظروں کے سامنے سے پردہ سا ہٹ گیا۔

کچھ دور جاتے ہی ہمیں سیاہ سانپ کی طرح بل کھاتی لمبی سڑک نظر آ گئی جو سیدھی بھاگل پور تک جاتی تھی۔ کچھ دور جاتے ہی ہمیں ایک ٹم ٹم نظر آئی تو ہم رانی کو بیمار بتا کر اس میں بیٹھ گئے۔

کہاں ٹھہرا جائے' یہ الگ مسئلہ تھا کیوں کہ ہندوؤں کے دھرم شالہ میں دھرم سنگھ اور رانی کو تو ٹھہرا لیا جاتا مگر مجھے ٹھہرنے کی اجازت نہیں ملتی۔ مجھے مسلم مسافر خانے میں ٹھہرنا پڑتا اور وہاں دھرم سنگھ اور رانی کو ٹھہرنے کی اجازت نہ ملتی۔ ایک ساتھ ٹھہرنے کا بس ایک ہی طریقہ تھا کہ کسی ہوٹل میں ٹھہرا جائے۔ میرے پاس ابھی اتنی رقم تھی کہ میں کسی بھی اچھے ہوٹل میں ایک ڈیڑھ ماہ گزار سکتا تھا۔ میں نے دھرم سنگھ سے کہا۔ ''کیوں نہ کسی ہوٹل میں کمرا لے لیا جائے۔''

''او یار! تو پاکستانی ہو کر بھی انتریامی (دل کی بات جان لینے والا) ہے۔ میں خود بھی یہی سوچ رہا تھا۔ ایک ساتھ ٹھہرنے کا بس یہی ایک راستہ ہے۔''

''تو پھر جلدی کرو اور کسی اچھے ہوٹل میں چلو۔''

''یہاں ہوٹل تو کئی ایک ہیں لیکن میری پسند کا بس ایک ہوٹل ہے ''بسیرا گیسٹ ہاؤس'' وہ ایک سردار جی کا ہے۔ اسی میں ٹھہر جاتے ہیں۔''

''تو پھر وہیں چلو' کتنی دور ہے؟''

''یہ جو سیدھا راستہ جا رہا ہے' یہ سیدھا خلیفہ باغ تک جاتا ہے۔ وہیں چورنگی پر ہے۔''

دھرم سنگھ کے ساتھ رانی کو سہارا دے کر ہم خلیفہ باغ پہنچے۔ بسیرا ہوٹل کئی منزلہ بلڈنگ پر مشتمل تھا۔ دھرم سنگھ نے کاؤنٹر پر جا کر بات کی اور مڑ کر بولا۔ ''ایک ڈبل بیڈ اور اسی کے برابر میں ایک سنگل بیڈ خالی ہے۔''

''لے لو!'' میں نے کہا۔

دھرم سنگھ نے میرا نام راکیش لکھا اور رانی کو اپنی بیوی ظاہر کیا۔ اس وقت تو میں نے کچھ نہیں کہا مگر کمرے میں آتے ہی میں نے اس کی خبر لے لی۔ ''تو رانی تمہاری بیوی ہے؟''

''یار فکر نہ کر دل خوش کرنے کے لیے لکھا دیا۔ ویسے تو مت ڈر میں بیوی والا حق نہیں مانگوں گا۔'' دھرم سنگھ نے مسکین صورت بنا کر جواب دیا۔

''یاد رکھنا رانی ابھی ہوش میں نہیں ہے۔ کوئی بدمعاشی کرو گے تو میں مزاج پرسی کر دوں گا۔ شیام سے تو نمٹ ہی رہا ہوں' تم سے بھی نمٹ لوں گا۔''

"اوئے یارا تو مجھے ایسا سمجھتا ہے۔بس دل بہلانے کے لیے دل لگی کر لیتا ہوں۔ ہاں وہ خود آجائے تو اور بات ہے۔"

"تو رانی میرے ساتھ ٹھہرے گی اور تو بھی اسی کمرے میں رہے گا۔"

"یعنی مجھے جگائے رکھنے کا تم نے پورا انتظام کر لیا ہے۔"

"اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں ہے۔وہ تیرا تایا شیام جو پیچھے لگا ہوا ہے اس لیے ہمیں جاگتے رہنا ہوگا۔"

"میں ایک رات کیا ساری عمر جاگ کر گزارنے پر تیار ہوں' شرط یہی ہے کہ میرے سامنے رانی رہے۔" دھرم سنگھ ہنس کر بولا۔

☆======☆======☆

رانی بیڈ پر آڑی ترچھی لیٹی تھی اور ہم صوفے پر بیٹھے تھے۔میں نے ایک نظر رانی پر ڈالی پھر بولا۔"ہمیں باری باری جاگنا ہوگا۔رات کے پچھلے پہر جاگنا زیادہ دشوار ہے اس لیے ایسا کرتے ہیں کہ پہلے پہر تم جاگ لو پھر تم سو جانا میں جاگ لوں گا۔"

"ہاں تم سو جاؤ۔"

"مگر یار د رہے کوئی بدمعاشی نہیں چلے گی۔" میں نے ہنس کر کہا۔

"یارا' میں اتنا بھی پاگل نہیں ہوں۔تم نر بھئے (بےفکر) ہو کر سو جاؤ۔"

مجھے یقین تھا دھرم صرف منہ کا برا ہے۔وہ ایسا ہے نہیں کہ اس سے خطرہ محسوس ہو۔ اس لیے میں اس کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گیا۔اس طرح اس کی پہرے داری بھی ہو جاتی۔

☆======☆======☆

وہ ایک طویل وعریض میدان تھا۔اتنا وسیع کہ دور دور تک کسی آبادی کا نام ونشان نہ تھا۔میں اس میدان میں کھڑا تھا۔کدھر جاؤں؟ یہی سوچ رہا تھا۔تبھی میرے اندر سے آواز ابھری کہ سیدھے چلتے چلے جاؤ۔میں نے اسی خیال پر عمل کیا اور ناک کی سیدھ میں چلنے لگا۔ آہستہ آہستہ فاصلہ طے ہوتا گیا۔تقریباً دو کوس کا فاصلہ طے کر چکا تھا کہ مجھے ایک حویلی نظر آئی۔ایسی حویلی جس کے مکین یقیناً صاحب حیثیت ہوں گے۔ان کے پاس موٹر بھی ہوگی۔ ان سے التجا کروں گا تو وہ کسی آبادی تک چھوڑ آئیں گے۔

میں یہی کچھ سوچتا ہوا آگے ہی آگے بڑھتا جا رہا تھا۔بالآخر اس حویلی کے دروازے

تک پہنچ گیا۔اندر داخل ہوا مگر کوئی دکھائی نہ دیا۔ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ایسی خاموشی تھی کہ روح میں اترتی محسوس ہو رہی ہو۔ایسا لگ رہا تھا جیسے میں قبرستان کے درمیان کھڑا ہوا ہوں' شہر خموشاں میں آ گیا ہوں۔اپنے دل کی دھڑکن مجھے کانوں میں سنائی دے رہی تھی۔ دل کہہ رہا تھا کہ بھاگ لو مگر کوئی ایسی انجانی کشش تھی جو مجھے کھینچ رہی تھی۔

بالآخر میں نے قدم آگے بڑھا دیے۔ایک کمرے سے دوسرے کمرے' دوسرے سے تیسرے کمرے میں چلتا چلا جا رہا تھا کہ ایک بڑا سا ہال آ گیا۔اس ہال کی لمبائی چوڑائی اتنی تھی کہ آرام سے ٹینس کھیلا جا سکتا تھا۔یہ حویلی کس کی ہے میں یہاں کیوں آیا؟ یہ سب یاد نہیں آ رہا تھا صرف اتنا یاد آ رہا تھا کہ مجھے یہاں ایک ضروری کام ہے۔وہ کام کیا ہے یہ بھی یاد نہیں آ رہا تھا۔

اس ہال کو پار کرتا ہوا میں دوسرے کنارے کی طرف بڑھ رہا تھا کہ میری نظر چھت پر پڑی اور میں ٹھٹک گیا۔چھت پر جابجا جالے لٹک رہے تھے۔مکڑیوں کے جالے۔

مکڑیوں کے جالے کوئی عجوبہ چیز نہیں ہے تقریباً ہر ویران گھر میں ہوتے ہیں مگر یہاں کے جالے تو انتہائی عجیب تھے۔ایسے جالے میں نے اس سے پہلے کہیں نہیں دیکھے تھے۔ان کے تار اتنے موٹے دکھائی دے رہے تھے جیسے مچھلیاں پکڑنے کی ڈور سے انہیں بنا گیا ہو۔

جالے سے زیادہ عجیب وہ مکڑیاں تھیں جو اس میں نظر آ رہی تھیں۔یہ مکڑیاں تشتری جتنی بڑی تھی۔ان کی رنگت بالکل سیاہ تھی۔ان کی ٹانگیں انسانی انگلیوں جتنی موٹی تھیں اور آنکھیں' اف اللہ! شرٹ کے بٹن جتنی تھیں اور ان آنکھوں میں ایسی چمک تھی کہ جیسے سانپ کی آنکھوں میں ہوتی ہے۔میری نظروں سے ان کی نظریں ملیں اور میں کانپ کر رہ گیا۔ایسا لگا جیسے وہ مجھے کینہ توز نظروں سے گھور رہی ہوں۔میں نے خوف سے نظریں پھیرنا چاہیں مگر ایسا ممکن نہ تھا۔گویا میری آنکھیں پتھرا گئی تھیں۔میں پلکیں جھپکانا بھول گیا تھا۔بس ایک ٹک دیکھے جا رہا تھا کہ ایسا لگا جیسے وہ مکڑی آگے بڑھی ہو۔ایک انچ دو انچ کئی انچ آگے سرک آئی تھی۔وہ جال کے کنارے کی طرف بڑھتی آ رہی تھی تبھی مجھے ایسا لگا جیسے کسی نے سیٹی بجائی ہو۔

میں نے مڑ کے دیکھا اور میرے اوسان خطا ہو گئے۔دل کی دھڑکن بڑھ گئی۔دل

زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔ کیوں کہ پیچھے سے بھی ایک مکڑی بڑھتی چلی آ رہی تھی۔ میری حالت ایسی تھی گویا ہاتھ پیروں میں جان نہ ہو' دل کی دھک دھک کانوں میں گونج رہی تھی۔ میں نے گھبرا کر اطراف کا جائزہ لیا تو روح فنا ہوگئی۔ ایک دو نہیں' درجنوں مکڑیاں بڑھی چلی آ رہی تھیں' میری سمجھ میں کچھ نہ آیا تو میں نے دوڑ لگا دی۔

میں دروازے تک پہنچنا چاہتا تھا۔ دروازہ چار' پانچ گز کی دوری پر تھا لیکن اس وقت ایسا لگا تھا جیسے میلوں کا فاصلہ ہو کیوں کہ دوڑتے دوڑتے میں تھک گیا تھا مگر دروازہ ہنوز اتنا ہی دور تھا۔ پتا نہیں زمین بڑی ہوگئی تھی یا پھر میری قوت ختم ہوگئی تھی۔

پیچھے سے پٹ پٹ کی آواز آئی تو میں نے مڑ کر دیکھا۔ چھت پر لٹکتے جالوں سے مکڑیاں کود کود کر نیچے اتر رہی تھیں۔ میں نے گھبرا کر اپنی رفتار اور بڑھا دی۔ کیوں کہ وہ سب اگر مجھ سے لپٹ جاتیں تو میرے جسم پر گوشت کا ایک ریشہ تک نہ بچتا۔ اس خیال کو تقویت بھی مل گئی۔ پتا نہیں کہاں سے ایک کتے نے چھلانگ لگائی تھی۔ شاید وہ مجھ پر جھپٹا تھا مگر میری رفتار تیز تھی اسی لیے وہ میرے سر پر سے گزرتا ہوا پیچھے گرا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ اس کی غراہٹ سنائی دی تھی۔ میں نے مڑ کر دیکھا تھا۔ اس کی گردن پر' پیروں پر کئی مکڑیاں لٹکی ہوئی تھیں اور کتے کے جسم سے بھل بھل خون نکل رہا تھا۔ وہ پنجے مار کے ایک کو گراتا تھا کہ دو تین مکڑیاں مزید لپٹ جاتی تھیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کے جسم سے ہڈیاں جھانکنے لگی تھیں۔ وہ خونخوار مکڑیاں اس کا گوشت چٹ کرتی جا رہی تھیں۔

ایسی گوشت خور مکڑیوں کے بارے میں' میں نے پڑھا تھا کہ افریقہ کے جنگلوں میں پائی جاتی ہیں مگر برصغیر میں بھی ان کی نسل ہے یہ میں نے آج جانا تھا۔ یہ یہاں کیسے آ گئیں؟ اس بارے میں غور کرنے کا وقت نہیں تھا اس لیے میں بگٹٹ بھاگ رہا تھا پھر بھی دروازے تک نہیں پہنچ پا رہا تھا۔ میں نے آخری کوشش کے طور پر لانگ جمپ لگائی صرف اس امید پر کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ زمین میرے پیروں کو پکڑے ہوئے ہے۔ اس سرزمین پر آ کر میں نے ایسے ایسے محیر العقول واقعات دیکھے تھے کہ اب کوئی بھی بات ناممکن نہیں لگتی تھی۔

یہ سچ بھی ہے کہ جب تک خود پر گزرتی نہیں ہے انسان اس بات پر یقین ہی نہیں کرتا ہے۔ آج سے صرف دو تین ماہ پہلے کوئی مجھ سے کہتا کہ بھوت پلید یا جنات کا وجود ہے تو میں

انکار میں سر ہلا دیتا کیوں کہ ایسی باتیں قصے کہانیوں ہی میں پڑھی تھیں کبھی دیکھا جو نہیں تھا مگر اب تو میں قسم کھا سکتا تھا کہ روحیں مدد بھی کرتی ہیں اور نقصان بھی پہنچاتی ہیں۔ جنات بھی اسی دنیا کے باسی ہیں' جادو منتر کی بھی قوت ہے اور کلام الٰہی بھی بطور ہتھیار استعمال کیا جاتا ہے۔

جمپ لگاتے وقت میں نے اللہ کا نام لیا تھا۔ اپنی مدد کے لیے اللہ کو آواز دی تھی۔ شاید یہ اسی کا کمال تھا کہ میں دروازے سے باہر جا کر گرا تھا۔ باہر گرتے ہی میں پھرتی سے اٹھ کھڑا ہوا تھا اور پھر دوڑنے لگا تھا۔

کافی دیر بعد مجھے احساس ہوا تھا کہ میں بھاگتے بھاگتے کسی ویرانے میں آ گیا ہوں جہاں چھوٹی چھوٹی کٹیلی جھاڑیاں دور دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ ان جھاڑیوں کو پھلانگتا ہوا میں دوڑ رہا تھا میرے پیچھے پٹاخے سے پھوٹ رہے تھے۔ یہ پٹ پٹ کی آوازیں مکڑیوں کے اچھلنے اور پھر زمین پر گرنے سے پیدا ہو رہی تھیں۔

میں دوڑتے دوڑتے تھک چکا تھا کہ دور پتھر پر بیٹھا ایک ہیولہ سا نظر آیا۔ میں نے اپنی رفتار مزید بڑھا دی۔ خوف کے عالم میں کسی انسان کا نظر آ جانا بہت بڑی بات ہوتی ہے۔ خاصی تقویت مل جاتی ہے۔ صرف دوسراہٹ کی وجہ سے میرا حوصلہ قوی ہو گیا تھا۔

آہستہ آہستہ درمیان کا فاصلہ گھٹتا جا رہا تھا۔ پھر میں اس کے قریب پہنچ گیا مگر اس نے میری طرف دیکھنے کی مطلق کوشش نہ کی۔ ''اے بھائی!''

میری آوز پر اس نے چونک کر سر اٹھایا۔ اس کی آنکھیں عجیب ویران ویران سی تھیں۔ وہ مجھے اس طرح سے دیکھ رہا تھا جیسے میں کوئی عجوبہ ہوں۔ میں نے ہی گفتگو کا آغاز کیا۔ ''اے بھائی یہاں سے آبادی کتنی دور ہے؟''

''کون سی آبادی؟'' اس نے پوچھا۔

''کوئی سی بھی!''

''میں خود دس دن سے آبادی تلاش کر رہا ہوں۔'' اس نے ناگوار لہجے میں جواب دیا۔ ''مگر مجھے کوئی آبادی مل کر نہیں دی۔ میں بھوکا پیاسا اس جنگل میں بھٹک رہا ہوں۔''

''تم آئے کہاں سے ہو؟''

''میں گھر سے سبزی لینے نکلا تھا کہ مجھے طوفان نے گھیر لیا۔ پتا نہیں پھر میرے ساتھ

کیا ہوا۔ ہوش آیا تو میں اس ویرانے میں یہیں پر لیٹا ہوا تھا۔ تب سے یہاں سے باہر نکلنے کے لیے کئی میل تک دوڑ رہا ہوں۔ صبح سے شام تک دوڑتا رہتا ہوں مگر پھر اسی جگہ خود کو پاتا ہوں۔''

اس کی عجیب وغریب کہانی سن کر میں شش و پنج میں پڑ گیا کہ یہ سچ بول رہا ہے یا بکواس کر رہا ہے۔ تبھی ایک جانی پہچانی آواز سنائی دی۔ ''اب بھی موقع ہے خود کو میرے حوالے کر دو ورنہ یہی انجام تمہارا ہوگا۔ یہیں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جاؤ گے۔''

اس آواز کو میں ہزاروں میں پہچان سکتا تھا۔ یہ آواز شیام کی تھی۔ اسی منحوس پجاری کی مگر وہ نظر نہیں آ رہا تھا صرف آواز سنائی دے رہی تھی۔

''اب بھی موقع ہے کیوں اپنی جان کو داؤ پر لگا رہے ہو۔'' اس کی مکروہ آواز پھر سنائی دی۔

''یہی تمہاری بھول ہے۔ ہر فرعون را موسیٰ است۔ یہ مت بھولو۔ میں تمہاری تباہی و بربادی بن کر آیا ہوں۔'' میں نے چیخ کر کہا۔

''تو تیار ہو جاؤ اپنی سزا بھگتنے کو۔'' ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ میں نے آیت الکرسی کا ورد شروع کر دیا۔ پتا نہیں یہ کلام الٰہی کی تاثیر تھی یا کچھ اور کہ پل بھر میں مَیں نے خود کو اپنے کمرے میں پایا۔

☆======☆======☆

یہ ایک عجیب بات تھی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں نے ابھی کچھ دیر پہلے جو کچھ دیکھا تھا وہ کیا تھا۔ خواب تھا یا حقیقت تھی۔ کیوں کہ سامنے بیڈ پر رانی تھی جو اس وقت بھی بے خبر پڑی تھی۔ صوفے پر دھرم سنگھ نیم دراز تھا دوسرے صوفے پر میں ہتھے پر سر ٹکائے لیٹا ہوا تھا۔ میں نے دھرم سنگھ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا میں کہیں گیا تھا؟''

''تم نے کہا تھا کہ آدھی رات تک میں جاگوں گا پھر تمہیں اٹھا کر سو جاؤں گا مگر ہوا الٹا۔ خود گدھے گھوڑے بیچ کر سو گئے۔'' دھرم سنگھ نے جواب دیا۔

یعنی میں نے ابھی جو کچھ دیکھا تھا وہ خواب تھا یہ بات ثابت ہو گئی تھی۔ میں مطمئن ہو گیا تھا۔ میں نے خود پر شیام کو مسلط کر لیا ہے اسی لیے خواب میں بھی اس کی آواز سنائی دینے لگی ہے۔ یہ سوچ کر میں نے خود کو تسلی دے لی اور دھرم سے بولا۔ ''تم سو جاؤ میں جاگ رہا ہوں۔''

دھرم سنگھ اسی صوفے پر لیٹ گیا اور میں نے جیب سے تسبیح نکال لی۔ یہ وہی تسبیح تھی جو میرے لیے انمول تحفہ تھی۔ یہ میرا ہتھیار تھی' دشمنوں پر وار کرنے کے لیے۔

میں اس تسبیح پر اسمائے باری تعالیٰ پڑھنے لگا۔ مجھے ساری رات جاگنا تھا کیوں کہ دھرم سنگھ پر بھروسا نہیں تھا۔ رانی اس وقت ہوش میں نہ تھی۔ دھرم سنگھ اسے اکیلا پا کر ہوش کھو سکتا تھا اس لیے مجھے پہرے داری کے لیے جاگنا ضروری تھا۔ میں نے جاگنے کے لیے ہی ورد کا سہارا لیا تھا۔

مجھے ورد کرتے ہوئے زیادہ دیر نہ ہوئی تھی کہ ایسا لگا جیسے دروازے پر دستک ہوئی ہے۔

''کون!'' میں نے پوچھا۔ مگر جواب نہ آیا۔

اس دستک نے مجھے اٹھنے پر مجبور کر دیا تھا۔ میں نے جا کر دروازہ کھول دیا مگر باہر کوئی نہ تھا۔ کوریڈور خالی پڑا تھا۔ میں نے دروازہ لاک کیا اور کھڑکی پر آ گیا۔ جہاں تک کر باہر دیکھا۔ سڑک بالکل سنسان تھی۔ سڑک پر جلنے والی لائٹ پوسٹ پر ایک کتا کھڑا تھا۔ میں کھڑکی سے ہٹ کر واپس صوفے پر آ گیا۔ ابھی صوفے کی پشت سے پیٹھ لگائی تھی کہ دستک پھر سنائی دی۔ میں جھلا کر کھڑا ہو گیا اور جھٹکے سے دروازہ کھولا۔ وہ شاید بیرا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا پھر بولا۔ ''سر! آپ سے کوئی ملنے آیا ہے۔''

''کون...... مجھ سے ملنے کون آ گیا؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''نیچے چل کر خود دیکھ لیں۔''

میں اس کے ساتھ چل پڑا۔ سنسان کوریڈور کو پار کرتا ہوا میں سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔

اس وقت مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے مجھے کوئی کھینچ رہا ہے۔ میں جانا نہیں چاہتا تھا پھر بھی چلتا چلا جا رہا تھا۔ سیڑھیاں نزدیک آ چکی تھیں۔ میں آہستہ آہستہ سیڑھیاں پھلانگتا ہوا نیچے اترنے لگا۔ بیرا مجھ سے آگے آگے چل رہا تھا۔ اس کے چلنے کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ بہت جلدی میں ہے۔ میں نے بھی اپنی رفتار تیز کر دی تھی۔ آہستہ آہستہ ہم سیڑھیوں سے نیچے آ گئے۔ نیچے ہال میں کاؤنٹر کلرک سر کاؤنٹر پر ٹیکے بے خبر سویا ہوا تھا۔ سامنے رکھے صوفے بھی خالی پڑے تھے۔ میں اس بیرے سے سوال کرنے والا تھا کہ ملاقاتی کہاں ہے کہ اس نے خود ہی کہا۔ ''وہ شخص باہر کھڑا ہے۔ میرے ساتھ چلتے رہیے۔''

میں اس کے پیچھے پیچھے باہر آ گیا۔ باہر آنے کے بعد بھی وہ رکا نہیں چلتا ہی رہا۔ اب میں ہوٹل سے کافی فاصلے پر آ گیا تھا پھر بھی وہ چلا جا رہا تھا۔

اچانک مجھے ٹھوکر لگی اور میں رک گیا۔ تبھی اس نے نسبتاً درشت لہجے میں کہا۔ ''وقت کم ہے اب کہیں رکنا نہیں۔''

وہ ایک معمولی سا بیرا تھا پھر بھی مجھ پر ایسے رعب گانٹھ رہا تھا جیسے میں اس کا نوکر ہوں۔ مجھے غصہ آنا چاہیے تھا مگر میں مطمئن سا اس کے پیچھے پیچھے چلتا چلا جا رہا تھا۔ مجھے اس کا انداز ذرا بھی برا نہیں لگا۔ مجھے خود بھی ایسا لگ رہا تھا جیسے میں جلد از جلد اس جگہ پہنچ جاؤں۔

اب میں کافی دور آ چکا تھا کیوں کہ اب میں شہری حدود سے باہر آ چکا تھا۔ اب میرے سامنے پہاڑی سلسلہ تھا۔ چھوٹی بڑی پہاڑیاں دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ میں انہی پہاڑیوں کی طرف بڑھ رہا تھا' پھر میں ایک پہاڑی کے بالکل نزدیک پہنچ کر رک گیا۔ اب میرے سامنے ایک غار سا تھا۔ میں اس غار کے دہانے پر کھڑا تھا۔ ''چلو اندر داخل ہو جاؤ۔'' اس نے کہا تھا اور میں نے آگے بڑھنے کے لیے قدم اٹھائے تھے کہ وہ چیخا۔ ''نہیں ٹھہرو پہلے اپنی تسبیح کو نکال کر پھینک دو پھر اندر جانا۔''

میرے دل میں شعائر اسلامی کی رمق جاگی اور میں نے انکار میں گردن ہلا دی۔

میرے انکار پر اس نے میری گدی پر ہاتھ لگایا اور ایسا اٹھا کر پھینکا کہ میں اڑتا ہوا کافی دور جا گرا پھر ہوش نہ رہا۔

جب ہوش آیا تو میں نے خود کو ایک لق و دق ریگستانی علاقے میں پایا۔ اٹھنے کی کوشش کی تو جسم کا جوڑ جوڑ احتجاج کرنے لگا۔ نس نس میں ٹیسیں اٹھنے لگیں۔ بہ مشکل کروٹ لے کر آہستہ سے اٹھا اور اطراف میں نظر ڈالی تو موت کا بھیانک تصور نظروں کے سامنے پھر گیا۔ تا حد نظر ریت ہی ریت نظر آ رہی تھی۔ میں اس صحرا تک کیوں کر پہنچا مجھے اس کا کوئی علم نہیں البتہ میری حالت قابل رحم تھی۔ میرے جسم پر موجود کپڑے تار تار ہو رہے تھے۔ ان پر جا بجا خون کے دھبے تھے۔

مجھے یاد آیا کہ میں رانی اور دھرم سنگھ کے ساتھ کمرے میں لیٹا ہوا تھا اور تبھی کوئی مجھے بلا کر لے گیا تھا۔ پھر اس نے میری گدی پر اپنا ہاتھ مارا تھا اور میں دور جا کر منہ کے بل گرا تھا۔ میں نے اپنے منہ پر ہاتھ پھیرا۔ بہا ہوا خون ابھی تک چہرے پر جما ہوا تھا۔ بھوک اور پیاس کی ناقابل برداشت شدت نے مجھے بے حد کمزور و نڈھال کر دیا تھا۔ اس بے بسی کے عالم میں مجھے ہر سمت موت نظر آ رہی تھی۔ مجھے اس وقت کچھ یاد نہ تھا۔ صرف دو گھونٹ پانی کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی تا کہ میں اپنے حلق کو تر کر سکوں۔ جس میں کانٹے پڑنے لگے تھے۔ میں نے ہمت کر کے اٹھنے کی کوشش کی۔ ایک دو بار مایوسی ہوئی پھر کسی نہ کسی طرح اٹھ کر کھڑا ہوا جوڑ جوڑ پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔

جن لوگوں کو کبھی ریت پر کھیلنے یا چلنے کا اتفاق ہوا ہے وہ بخوبی جانتے ہیں کہ ریت پر چلنے میں انسان کی دوگنی طاقت صرف ہوتی ہے۔ میں رک رک کر ہانپ ہانپ کر خود کو

گھسیٹ رہا تھا۔

بہ مشکل سو گز چلا ہوں گا کہ میری آنکھوں کے آگے اندھیرے لپکنے لگے۔ پیاس کی شدت نے بے حال کر دیا۔ میں نے اپنا توازن برقرار رکھنے کی کوشش کی مگر مایوسی ہوئی اور تیورا کر ریت پر آ رہا۔ آسمان پر نظر پڑی تو موت کا تصور مزید پختہ ہو گیا۔ میرے عین اوپر آسمان کی وسعتوں میں دو گدھ بازو پھیلائے' مجھ پر نظر جمائے میری موت کے منتظر تھے۔

خوف و دہشت کے احساس سے مجھے جھرجھری آ گئی۔ میں نے اٹھنے کی کوشش کی۔ میں خود کو کسی محفوظ مقام تک گھسیٹ لے جانا چاہتا تھا تاکہ خود کو ان گدھوں کی خوراک بننے سے محفوظ رکھ سکوں لیکن اب مجھ میں اتنی سکت نہ تھی کہ میں پیروں پر کھڑا ہو سکتا۔ میں نے اپنے ذہن کو بیدار رکھنے کی بہت کوشش کی لیکن غنودگی بڑی تیزی سے مجھ پر حملہ آور ہو رہی تھی۔ میرا ذہن سوتا جا رہا تھا۔ ہوش و حواس ساتھ چھوڑ رہے تھے۔ سورج کی حدت سے تپ کر ریت کے ذرات جسم میں سوراخ کرتے محسوس ہو رہے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ ننھے ننھے نیزوں کی انیاں ہر مسام سے اندر دھنس رہی ہیں۔ جلن کا احساس جان لے رہا تھا۔ پھر بھی غنودگی میں کمی نہیں آ رہی تھی۔

میں نے بند ہوتی آنکھوں کو کھول کر گدھوں پر نظر ڈالی۔ وہ کچھ اور نیچے آ گئے تھے۔ میں نے اذیت کے احساس سے آنکھیں بھینچ لیں۔ اسی وقت ایسا لگا جیسے کسی نے زنبور سے میرے بازو کو کھینچا ہو اور گوشت کا لوتھڑا سا میرے جسم سے علیحدہ ہو گیا ہو۔ میں سمجھ گیا تھا کہ گدھوں نے مردہ جان کر مجھ پر حملہ کر دیا ہے اور میں پوری طرح بے ہوش ہو گیا۔

''اے اب اٹھ بھی جاؤ' مجھے بھی سونا ہے۔'' اس آواز نے میرے اندر قوت بھر دی اور میں چونک کر اٹھ بیٹھا۔

میں صوفے پر ہی بیٹھے بیٹھے سو گیا تھا۔ میں نے شکر ادا کیا کہ یہ صرف خواب تھا۔ میں یہاں سے کہیں نہیں گیا تھا۔

''چائے پیو گے؟'' دھرم سنگھ نے پوچھا۔

''یہ تو صرف ریسٹ ہاؤس ہے کھانا تو ملتا نہیں ہے پھر چائے کہاں سے آ گئی؟'' میں نے پوچھا۔

''کاؤنٹر پر جو بندہ بیٹھا ہے' اسی سے سردار جی نے منگوائی تھی۔ وہ تھرموس میں لے

آیا تھا۔'' کہہ کر اس نے بھاپ اڑاتی چائے کا کپ میری طرف بڑھا دیا۔

میں نے چائے کا کپ لے کر کہا۔ ''ٹھیک ہے سو جاؤ۔ یوں بھی اب دن نکلنے میں وقت ہی کتنا رہا ہے۔ تین بج رہے ہیں۔ دو گھنٹے بعد اجالا پھیل جائے گا۔''

دھرم سنگھ صوفے پر نیم دراز ہو گیا پھر کچھ ہی دیر میں اس کے خراٹے گونجنے لگے۔

میں نے خراٹوں کی آواز سے تنگ آ کر ٹہلنا شروع کر دیا۔ عین اسی وقت لاؤڈ اسپیکر پر مؤذن کی مسحور کن آواز سنی۔ وہ جذب کے عالم میں فلاح کی طرف پکار رہا تھا۔ میں نے ایک عرصے سے نماز نہیں پڑھی تھی۔ نماز پڑھتا بھی تو کیسے؟ مجھے طاغوتی قوتوں نے اپنے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ ایک لمحے کو بھی میں اسے گنوانا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے نماز باجماعت پڑھنے کا ارادہ کر لیا اور کمرے سے نکل آیا۔ دروازہ بھیڑ دیا اور سیڑھیاں طے کرتا ہوا نیچے آ گیا۔

گیٹ بند تھا۔ کاؤنٹر پر ایک نوجوان سکھ سو رہا تھا۔ میں نے اسے آواز دی تو وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

''جی!'' اس نے آنکھیں ملتے ہوئے پوچھا۔

''میں ذرا چہل قدمی کے لیے باہر جانا چاہ رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''جی صاحب!'' کہہ کر وہ چابی لے کر دروازے پر پہنچا۔ اس نے تالا کھول دیا۔

میں نے باہر نکل کر ادھر اُدھر دیکھا دراصل میں اندازہ لگانا چاہتا تھا کہ مسجد کہاں؟ تبھی پھر آواز آئی۔ ''جماعت کھڑی ہونے میں صرف پانچ منٹ باقی ہیں۔''

میں اس آواز کے سہارے ادھر ہی بڑھتا چلا گیا۔ چورنگی پار کرتے ہی ایک [illegible] نظر آئی جس کے گیٹ پر بورڈ لگا ہوا تھا۔ ''شاہ مارکیٹ'' مسجد اس کے اندر تھی۔ میں ادھر بڑھتا چلا گیا۔

میں نے نماز ادا کی اور باہر نکل آیا۔ باہر آ کر میں نے دیکھا۔ زندگی پوری طرح جاگ اٹھی تھی۔ سائیکل رکشا والے' دودھ والے' اوپلے والیاں' خوانچہ فروش اپنی اپنی روزی کی تلاش میں نکل آئے تھے۔ چورنگی پر پہنچا تو ایک جگہ بھیڑ سی نظر آئی۔ نزدیک پہنچا تو پتا چلا کہ وہ چائے فروش ہے۔ لوگ بھیڑ لگائے کھڑے تھے' دکان دار مٹی کے پیالوں میں چائے دے رہا تھا جسے لوگ بڑی رغبت سے پی رہے تھے۔ میں نے بھی ایک پیالی چائے کا آرڈر

دیا۔ پچاس پیسے لے کر اس نے چائے کی پیالی تھما دی۔ پہلے ہی سپ میں پتا چل گیا کہ واقعی چائے ذائقے والی ہے اسی لیے اتنی بھیڑ لگی ہوئی ہے۔ لوگ چائے کے ساتھ پاپے بھی کھا رہے تھے۔ میں نے بھی پاپے کا آرڈر دیا۔

چائے پی کر لوٹا تو ریسٹ ہاؤس کی صفائی ہو رہی تھی۔ سردار گیانی سنگھ نے مجھے پرنام کیا۔ اس نے رات میں ہی واقفیت ہو گئی تھی کہ وہ اس ہوٹل ''بسیرا'' کا مالک ہے۔ دھرم سنگھ کا حکم تھا کہ میں کسی سے بات نہ کروں۔ کیوں کہ میرا لب ولہجہ چغلی کھا جاتا تھا۔ پھر میں ہندی کے الفاظ کا بہت کم استعمال کرتا تھا۔ اتنی انڈین پکچر دیکھتا تھا پھر بھی دماغ میں لفظ رہ نہ پاتے تھے۔ اس کا بہترین حل یہی تھا کہ میں کم سے کم بولوں۔ اسی لیے میں سر کے اشارے سے پرنام کا جواب دے کر آگے بڑھتا چلا گیا۔

کمرے میں پہنچا تو دھرم سنگھ بے خبر سو رہا تھا۔ اس کے خراٹے اسی طرح زور وشور سے گونج رہے تھے۔ رانی کی حالت اب بھی پہلے ایسی تھی۔ میں نے سرتاپا اسے دیکھا اور صوفے پر بیٹھ گیا۔

ابھی مجھے وہاں بیٹھے زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ کمرے کے دروازے پر زوردار دستک ہوئی۔ ایسا لگا جیسے اگر کھولنے میں دیر ہوئی تو دروازہ توڑ دیا جائے گا۔

میں نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔ اس شور سے دھرم سنگھ بھی اٹھ گیا تھا۔

اس نے غراتی آواز میں کہا۔ ''اوے گیانیے! تیرا دماغ خراب ہے جو اپنے ہی دروازے کو توڑ رہا ہے۔''

''بک بک بند کر اور دروازہ کھول۔'' باہر سے آواز آئی۔

''ابے تو ہے کون؟'' دھرم سنگھ نے کہا۔

''پولیس!'' باہر سے آواز آئی۔

''ارے باپ رے!'' کہہ کر دھرم سنگھ اپنے کھلے بالوں کو سمیٹتے ہوئے دروازے کی طرف تیزی سے بڑھا۔

دروازہ کھلتے ہی چار پانچ پولیس والے اور ایک سب انسپکٹر اندر آ گیا۔

''اوئے تو پاکستان سے آیا ہے ناں!'' انسپکٹر نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

''میں غیر قانونی طور پر نہیں آیا ہوں۔'' میں نے بے خوفی سے جواب دیا۔ ''میرا

پاسپورٹ دیکھ لیں۔ آپ کے سفارت خانے نے میرے نام ویزا جاری کیا ہے۔''

''روا کو ہیں تو ہم ابھی اصلی بات اگلوا سکتے ہیں۔'' ایک سپاہی ٹھیٹ بھوج پوری زبان میں بولا۔

''روا کا ہے بولے لا۔ انسپکٹر صاحب کھودی (خود ہی) سب انکواری کر لیبے۔'' دوسرے سپاہی نے کہا۔

''اچھا تم دونوں چپ رہو۔ ہمکا انکواری کرنے دو۔'' کہہ کر سب انسپکٹر میری طرف چہرہ کر کے بولا۔ ''ہاں جی اب بولو تم نے پولیس ہیڈ آفس میں اپنا نام درج کرایا؟ بارڈر کراس کرتے وقت تمہیں یہ ہدایت نہیں ملی تھی کہ بھارت کا لاء ہے جو بھی پاکستانی ناگرک یہاں آئے گا اسے ضلع ہیڈ کوارٹر میں اپنا نام لکھوانا ضروری ہے تم نے اپنا نام کیوں نہیں لکھایا' بولو؟''

''بس جی غلطی ہو گئی۔ وہ تمام کاغذات میرے بیگ میں موجود ہیں۔ کہیے تو دکھا دوں۔''

''تھانے چل کر دکھانا۔'' کہہ کر اس نے اپنے ساتھ آنے والے سپاہیوں میں سے ایک کو اشارہ کیا کہ مجھے ہتھکڑی لگا دی جائے۔

سپاہی نے اپنی کمر سے بندھی ہوئی ہتھکڑی کھولی اور اسے میرے ہاتھوں میں لگا دیا۔

مجھ پر سکتہ سا طاری تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہ بہت برا ہوا ہے۔ اب یہ لوگ مجھے تھانے لے جا کر عجیب عجیب سے سوالات کریں گے۔ پتا نہیں کیا کیا پوچھیں۔ میں انہیں کیسے یقین دلاؤں گا کہ یہ سب کچھ غلطی سے ہوا ہے۔ حالات نے مجھے اس طرح جکڑ لیا تھا کہ میرے پاس اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ اگر وقت مل جاتا تو میں ضرور اپنا نام درج کراتا۔

ابھی میں سوچ میں گم تھا کہ ایس آئی نے اشارہ کیا اور سپاہی نے ہتھکڑی کی زنجیر کو جھٹکا دیا۔ اشارہ سمجھتے ہی میں باہر کی جانب چل پڑا۔ کمرے سے باہر نکلا اور سیڑھیوں سے نیچے اترا۔ کاؤنٹر کے سامنے سے گزرتے ہوئے مجھے ایسا لگا جیسے کاؤنٹر مین مجھ پر ہنس رہا ہے۔ میں نے جلدی سے سر جھکا لیا اور مرکزی دروازے سے باہر نکلا۔

اب ہمارا رخ خلیفہ باغ کی چورنگی کی طرف تھا۔ لوگ آ جا رہے تھے۔

ابھی ہم چورنگی پر پہنچے بھی نہیں تھے کہ سامنے سے آتا ہوا پولیس کا ایک دستہ نظر آیا۔

اس میں بھی ایک ایس آئی تھا۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹنے لگی تھیں۔ اس کے دیگر ساتھیوں کی آنکھوں میں بھی استعجاب تھا۔ نووارد ایس آئی نے نزدیک پہنچ کر میرے ساتھ چلنے والے ایس آئی سے پوچھا۔ ''اے تو کون ہے رے؟''

''میں ایریا انچارج ہوں۔'' میرے ساتھ والے ایس آئی نے جواب دیا۔

''اگر تو اس علاقے کا انچارج ہے تو پھر میں کون ہوں؟''

''یہ تو اپنے اماں ابا سے پوچھ۔''

''ارے گھونچو! کوتوالی پر آج کی ڈیوٹی میرے ذمے تھی پھر تو کہاں سے ٹپک پڑا۔''

''ابے اولنڈھک' زبان سنبھال کر بات کہو یہ میرا علاقہ ہے یہاں میری ڈیوٹی ہے۔'' میرے ساتھ والے ایس آئی نے انتہائی ہتک آمیز لہجے میں کہتے ہوئے اپنے ہاتھ میں پکڑے ڈنڈے کو نووارد ایس آئی کی ٹھوڑی سے لگا کر اس کا چہرہ اوپر کیا۔

اس حرکت نے نووارد ایس آئی کے چہرے پر غصے کی سرخی بکھیر دی مگر وہ اپنے غصے پر قابو پانے کی کوشش کرتا ہوا بولا۔ ''تمیز سے بات کرو۔''

عجیب منظر تھا۔ دونوں اپنی اپنی بات پر اڑے ہوئے تھے۔ ان میں اصلی کون اور نقلی کون تھا کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ تماشائیوں سے سڑک بھر گئی تھی۔ لوگ ہنس رہے تھے' آوازے کس رہے تھے اور درمیان میں' میں سر جھکائے کھڑا شرم سے پانی پانی ہو رہا تھا۔

میرے ساتھ والے ایس آئی نے زور سے چلا کر کہا۔ ''مجھے تمیز سکھاتا ہے؟''

نووارد نے چیخ کر اپنے سپاہیوں کو حکم دیا۔ ''پکڑ لو انہیں۔''

تمام سپاہیوں کے ہاتھ میں اسلحے کی جگہ صرف ڈنڈے تھے۔ شاید بھارت میں سپاہیوں کو رائفلیں نہیں دی جاتی ہیں۔ سپاہی ڈنڈا سنبھال کر آگے بڑھے۔ انہیں بڑھتا دیکھ کر میرے ساتھ والے بھی مقابلے کے لیے تیار ہو گئے۔ پھر تو ایسا لگا جیسے ریسٹ ہاؤس کے باہر میدان جنگ کی فلم بندی شروع ہو گئی ہو۔ دونوں طرف کے سپاہی ڈنڈے سے ایک دوسرے کا مقابلہ کرنے لگے۔ ڈنڈے سے ڈنڈے ٹکرا رہے تھے۔ سر بھی پھوٹ رہے تھے اور چیخیں بھی بلند ہو رہی تھیں۔ دیکھنے والوں کا ازدحام ہوتا جا رہا تھا۔ دونوں طرف کے پولیس والے گویا پاگل ہو اٹھے تھے۔

یہ انوکھی جنگ عروج پر تھی۔ بٹیر بازی' مرغی بازی' پتنگ بازی' مینڈھا لڑانا' بھینسا

لڑانا' کشتی کرانا جیسی بازیاں تو لگتی ہی رہتی تھیں۔ جہاں بھی ایسا کوئی مقابلہ ہوتا تھا لوگ دیکھنے کے لیے ٹوٹ پڑتے تھے پھر آج ''پولیس بازی'' میں لوگ دلچسپی کیوں نہ لیتے۔ اس کے لیے صبح ہی صبح خلیفہ باغ چوک پر اتنے لوگ جمع ہو گئے تھے۔ بھیڑ لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جا رہی تھی۔ لوگ بھرپور دلچسپی لے رہے تھے۔ خوب خوب شور مچا رہے تھے۔

''جما کے بھائی جما کے...... واہ بھائی پیر پہ...... واہ شیر جوان کمر پر جما...... ہے ہے بے دل خوش کر دیا ایک اور جما کے۔''

لوگ شور مچا مچا کر حوصلہ دے رہے تھے۔ ''اے عزت کا سوال ہے' حرام کی بہت کھالی...... زوردار مار زوردار۔''

جنگ عروج پر تھی کہ پہلے والا سب انسپکٹر میری طرف مڑ کر بولا۔ ''یہ جنگ یہاں والے کبھی نہیں بھولیں گے۔ جب بھی کہیں کوئی بساط بچھے گی' بٹیر بازی یا مرغ بازی ہو گی تو اس پولیس بازی کی بات بھی نکلے گی۔ یہ تمہارے لیے پیغام ہے خود کو سنبھالو ورنہ بے موت مارے جاؤ گے یہ کھیل بہت ہو گیا۔ اب بھی وقت ہے جہاں سے آئے ہو وہاں چلے جاؤ۔ شیام کو بھلا دو' اپنے دادا کی وصیت کو بھلا دو سمجھے۔''

اس سب انسپکٹر کی بات ختم ہوئی تھی کہ ایک عجیب واقعہ رونما ہوا اور یکا یک ہی بھیڑ کائی کی طرح چھٹ گئی۔ ایسی بھگدڑ مچی کہ کئی لوگ نیچے گر گئے اور بھاگنے والے ان کے اوپر سے گزرتے چلے گئے۔ بات یہ ہوئی تھی کہ میرے ساتھ ہوٹل سے نکلنے والے تمام پولیس والے یکا یک ہی دھواں بن کر ہوا میں تحلیل ہو گئے تھے۔

☆======☆======☆

''شری مان جی' یہ سب کیا تھا؟'' انسپکٹر کا چہرہ ابھی تک زرد تھا۔ ایک وہی نہیں' وہاں جتنے بھی لوگ تھے' سب کے چہروں پر خوف کے سائے تھے۔ ان سب نے شاید اپنی زندگی میں ایسا منظر نہیں دیکھا تھا۔ اگر خود میری زندگی میں اپنے عجیب و غریب واقعات پیش نہ آئے ہوتے تو میں بھی ایسا منظر دیکھ کر دہل اٹھتا مگر اب تو یہ سب میرے لیے معمول کی بات بن چکی تھی۔ میں نے ہنس کر کہا:

''یہ سب بھوت تھے۔''

''بھوت' ہاں' بھوت تھے تبھی تو غائب ہو گئے مگر کیوں آئے تھے؟'' اس نے کھوئے

کھوئے لہجے میں سوال کیا۔

''محترم! میں تو سمجھ نہیں پایا ہوں کہ بات کیا تھی۔ وہ کیوں آئے تھے مگر اتنا ضرور سمجھ گیا ہوں کہ اس پوری واردات میں صرف آپ ہی آپ تھے کیونکہ اس نے صرف آپ کو مقابلے کی دعوت دی تھی۔''

میری بات سنتے ہی وہ بری طرح گھبرا اٹھا۔ اس نے رو دینے والے انداز میں کہا۔

''شری مان! میں نے ڈاکو بھیم سنگھ سے مقابلہ کیا۔ سنگرام یادو جیسے غنڈے کو مار گرایا۔ ہردیو لال جیسے آتنک وادی کو گھیرا۔ ارے بھائی! میرا نام سن کر بڑے بڑے اپرادھی (مجرم) کانپتے ہیں مگر میں...... اس سے خود میں کانپ رہا ہوں۔''

''اس میں کانپنے کی کیا بات ہے؟'' میں نے معصومیت بھرے انداز میں پوچھا۔

''باپ رے باپ! بھوت سے مقابلہ...... نہیں' نہیں! مجھ پر دیا کرو۔''

''دیا...... (رحم) مگر کیوں؟''

''بھوت کو سمجھاؤ...... اسے بتاؤ' میں ہنومان بھگت ہوں۔''

مجھے خود خبر نہ تھی کہ یہ ہنومان کیا چیز ہے مگر اندازہ لگا لیا تھا کہ یہ بھی ان کا کوئی بھگوان ہے اس لیے میں نے کہا۔ ''تو ہنومان سے کہو' وہ بھوت سے فائٹ کرے۔''

''ہاں' ہاں' بھگت جی! میں آج ہی سے ہنومان چالیسا کا پاٹھ شروع کردوں گا۔''

ایک سپاہی نے آگے بڑھ کر کہا۔ وہ خاصا تندرست تھا اور اس سے زیادہ تندرست اس کا پیٹ تھا جو بیلٹ کے اوپر سے چھلکا پڑ رہا تھا۔

''ارے واہ' رام لبھایا! دیر کاہے کرت ہو۔ جلدی جلدی ہنومان چالیسا پڑھو نا۔''

ایک دوسرے سپاہی نے کہا۔ اس کا چہرہ بھی خوف سے سفید تھا۔

رام لبھایا نامی وہی موٹا سپاہی جلدی جلدی پڑھنے لگا۔ ''بھوت پچاش نیکٹ نا ہی آوے۔ رام نام جب جاپ سناوے' جے ہنومان گیان گن ساگر۔''

مجھے ہنسی آ رہی تھی مگر میں ہنس کر اپنا امیج بگاڑنا نہیں چاہتا تھا اس لیے خاموش رہ گیا۔

وہ سب چلے گئے۔ ان کے جاتے ہی میرے ذہن میں وسوسے کلبلانے لگے۔

پولیس والے جب تھانے پہنچیں گے تو اس کا ذکر دوسروں سے بھی کریں گے۔ لوگ خواہ مخواہ سوال و جواب کریں گے۔ اس سوال و جواب سے کوئی نئی کہانی بھی جنم لے سکتی تھی۔ اس

ہوٹل میں ٹھہرنے سے پریشانیاں بھی پیدا ہوسکتی تھیں۔ یہ بات جب پھیلتی تو ایس آئی سے سوال و جواب ہوتے۔ افسران تفتیش بھی کراتے اور مجھے بھی کھینچا جاتا۔ مجھ سے پوچھ گچھ ہوتی تو مجھے بتانا پڑتا کہ میں پاکستان سے آیا ہوں۔ پاکستان کا نام سنتے ہی تعصب پرستوں کے کان کھڑے ہوجاتے۔ میں نے اتنے ہی دنوں میں دیکھ لیا تھا کہ یہاں دھرم سنگھ جیسے پیارے لوگ ہیں تو تعصب پرست بھی۔ تعصب پرستوں کے سامنے اگر پاکستان کا نام بھی آجائے تو ان کی پیشانی پر بل پڑ جاتے ہیں۔ وہ لفظ ''پاک'' سے بھی خوف زدہ رہتے ہیں اس لیے کسی افسر کے سامنے آنے سے گریز کرنا ہی صحیح ہے۔

''مگر میں کہاں جاؤں؟'' یہ ایک ایسا سوال تھا جس نے مجھے پریشان کر رکھا تھا۔

میں نے دھرم سنگھ کو اشارہ کیا کہ وہ میرے پیچھے پیچھے آجائے۔ دھرم سنگھ نے میرا اشارہ سمجھ لیا تھا اس لیے وہ میری طرف بڑھنے لگا۔

اسے نزدیک آتے دیکھ کر میں سیدھا بڑھتا چلا گیا۔ کچھ دور آنے کے بعد مڑ کر دیکھا۔ دھرم سنگھ تیز تیز قدموں سے نزدیک آتا جا رہا تھا۔ میں ایک دکان کے برابر سے گزرتی سڑک پر مڑ گیا اور ایک بند دکان کے تھڑے پر بیٹھ گیا جیسے وہ میری اپنی دکان ہو۔ کچھ ہی دیر میں دھرم سنگھ بھی آگیا۔ اس نے نزدیک پہنچ کر کہا۔ ''کیا بات ہے؟ اتنے پُراسرار انداز میں کیوں بلایا؟''

''تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ میں ہندوستانی نہیں ہوں اور کسی بھی بڑے افسر سے مل نہیں سکتا۔ یہ بات پھیلے گی تو لوگ اس کیس میں بہت زیادہ دلچسپی لیں گے اس لیے میں نے سوچا ہے کہ کسی دوسری جگہ شفٹ ہوجاتے ہیں۔''

''کہاں؟''

''کسی مسلم ایریا میں۔''

''یہاں کئی مسلم ایریاز ہیں مگر افسوس کی بات یہ ہے کہ یہاں کا ایک بھی مسلمان میرا دوست نہیں ہے۔''

''ایسا کرتے ہیں کہ رانی کو لے کر نکلتے ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''اس طرح کسی بھی مسلم ایریا میں ایک نہ ایک گھر مل ہی جائے گا۔''

''نہیں' رانی لباس' چال ڈھال' انداز و اطوار سے ہی پہچان لی جائے گی کہ وہ

مسلمان نہیں ہے اور میں تو اپنی پگڑی کی وجہ ہی سے سکھ نظر آتا ہوں۔ ہمیں دیکھ کر اگر گھر خالی ہوا بھی تو نہیں دیا جائے گا اسی لیے میں رانی کے پاس ٹھہر جاتا ہوں۔ تم تاتار پور چلے جاؤ۔ وہ مسلمانوں کا علاقہ ہے۔ وہاں تمہیں ایک نہ ایک گھر مل ہی جائے گا۔''

''ٹھیک ہے' میں نکلتا ہوں' تم رانی کے پاس جا کر بیٹھو۔''

دھرم سنگھ کو وہاں چھوڑ کر میں اکیلے ہی تاتار پور کی طرف چل پڑا اور پوچھتے پوچھتے تاتار پور جا پہنچا۔

وہ ایک چھوٹا سا بازار نما محلہ تھا۔ کئی ریسٹورینٹس اور اہم چیزوں کی دکانیں تھیں۔ ایک دو کتاب گھر بھی تھے جن کے باہر اسٹینڈ پر کئی میگزین لگے ہوئے تھے۔ میں نے ایک میگزین اٹھایا۔ ابھی ورق گردانی کر ہی رہا تھا کہ ایک نوجوان نے آ کر اسی میگزین کی دوسری کاپی اٹھائی تبھی دکاندار نے کہا۔ ''او بھائی' کیا کھڑے کھڑے پورا پرچا پڑھ لو گے؟''

''آں' اس کی قیمت کیا ہے؟'' میں نے پوچھا پھر قیمت دیکھ کر روپے بڑھا دیے۔

''لگتا ہے' آپ کا ذوقِ مطالعہ کافی اعلیٰ ہے۔'' نوجوان پرچہ اسٹینڈ پر رکھ کر بولا۔

''جی' بس پڑھنے کا شوق ہے۔'' کہہ کر میں نے اس کی طرف مسکرا کر دیکھا۔

''شوق تو مجھے بھی ہے مگر کیا کروں' جیب اجازت نہیں دیتی۔'' اس نے حسرت بھرے لہجے میں کہا۔

''باتیں تو بڑی دلچسپ کر لیتے ہو۔ آؤ' چائے پیو۔'' میں نے دعوت دی۔

کتاب گھر کے برابر میں ہی چائے کی دکان تھی۔ میں اسی میں اسے لے آیا اور چائے کا آرڈر دے کر ایک خالی بنچ پر بیٹھ گیا۔

''تم کرتے کیا ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''میں مسلم کالج میں لیکچرار ہوں۔'' اس نے اس طرح کہا جیسے وہ لیکچرار نہ ہو' کسی دفتر میں معمولی پیون ہو۔

''ارے واہ' تم لیکچرار ہو' یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔'' میں نے اس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''بھائی میرے' یہ ہندوستان ہے۔ یہاں مسلمان افسران کو پیر کی جوتی بنا کے رکھا

جاتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ سید شہاب الدین جیسے آئی پی ایس ٹاپ کرنے والے افسر نے نوکری کو لات ماردی۔ ایسی حالت میں تعصب پرست افسر مسلم اسٹوڈینٹس کا حال کیسا بنائے رکھتے ہیں' یہ بھی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ یہاں اس شہر میں مارواڑی کالج بھی ہے' اور بھی کالجز ہیں۔ سب کی حالت بہترین ہے۔ گرانٹ بھی خوب خوب ملتی ہے مگر مسلم کالج کو اب بھی چندے پر گزارہ کرنا پڑ رہا ہے۔ اس حالت میں لیکچرارز کی تنخواہ کیا ہوگی' یہ آپ بھی اندازہ لگا سکتے ہیں۔'' اس نوجوان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

ہم پاکستان میں اللہ تعالیٰ کی رحمت کے سائے میں' امن و آشتی میں رہتے ہیں اس لیے' ہمیں کب خبر کہ کس کس کو کہاں کہاں کیسے کیسے ''مسلمان'' ہونے کی سزا دی جا رہی ہے؟ اس نوجوان کی باتوں نے مجھے اندر تک ہلا کر رکھ دیا تھا۔ میں نے اس کی پیٹھ پر شفقت بھرا ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔ ''تمہارا نام کیا ہے؟''

''منصور انصاری!''

''منصور' میں یہاں اجنبی ہوں۔ کل ہی آیا ہوں۔ کیا مجھے ٹھہرنے کے لیے مکان مل سکتا ہے؟ کرائے پر مکان لوں گا۔''

''ہاں' ہاں' کیوں نہیں مگر آپ اکیلے ہیں ناں؟''

''نہیں' میرے ساتھ ایک سکھ اور ایک لڑکی بھی ہے۔''

''سکھ کی وجہ سے آپ کو کوئی بھی مکان نہیں دے گا۔ دراصل ہم اپنے علاقے میں کسی غیر مسلم کو بسنے نہیں دیتے کیونکہ اس طرح ہمارا علاقہ مخدوش ہو جاتا ہے۔ آپ لوگ ایسا کریں کہ ہمارے گھر میں بطور مہمان ٹھہر جائیں۔ میں لوگوں سے یہی کہوں گا کہ ایک دو دن کے لیے مہمان آئے ہیں۔''

مشورہ معقول تھا۔ میں نے ہامی بھر لی۔ اسی وقت ہوٹل جا کر رانی اور دھرم سنگھ کو لے آیا۔

منصور جس علاقے میں رہتا تھا' اس محلے کا نام کبیر پور تھا۔ کبیر پور' ناتھ نگر اور تاتار پور کے درمیان تھا۔ گویا میں شہر کے تقریباً درمیان میں تھا۔ دونوں طرف مسلمان بستیاں تھیں اس لیے پجاری کا ڈر بھی نہیں تھا۔ ایک مسلمان کے گھر میں رہ کر ہی میں شیام سے ٹکرا سکتا تھا۔ میرا وہ قیمتی سرمایہ جس کی چاہ میں' میں نے اتنا لمبا سفر طے کیا تھا' پاکستان سے

یہاں تک آیا تھا' اسے حاصل کرنے کے لیے مجھے شیام سے طویل جنگ لڑنا تھی اور اس جنگ کے لیے مجھے کسی مسلمان کے گھر کی ضرورت تھی کیونکہ ہر مسلمان کا گھر ایک قلعہ ہوتا ہے۔ طاغوتی قوتوں کے خلاف سب سے محفوظ پناہ گاہ! کیونکہ مسلمان اپنے گھر میں ایک دو طغرے ضرور لٹکاتے ہیں۔ یہ طغرے سجاوٹ کے ساتھ آفات و بلیّات سے بھی بچاتے ہیں۔ مسلمان گھرانوں میں ایک نہ ایک نمازی بھی ہوتا ہے اور جو نمازی ہوتے ہیں' وہ دن میں پانچ بار اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرتے ہیں۔ اس کے آگے سجدہ ریز ہوتے ہیں۔ جب بار بار دروازے پر دستک دی جائے تو کیا دروازہ نہیں کھلے گا؟ وہ تو سب کی سننے والا ہے۔ کافر کی بھی سنتا ہے اس لیے اپنے بندے پر حصار رکھتا ہے۔ مجھے بھی حصار کی ضرورت تھی اس لیے میں نے منصور کے گھر کو پسند کر لیا تھا۔

اس گھر میں آئے ہوئے مجھے دوسرا روز تھا۔ میرے ساتھ رانی اور دھرم سنگھ بھی تھے۔ باہر کے دونوں کمرے میرے تصرّف میں تھے۔ ایک میں' میں اور دھرم سنگھ سو رہے تھے اور دوسرے میں رانی۔

رانی ابھی تک نیم بے ہوشی کی حالت میں تھی۔ پتا نہیں' اس پر شیام نے کس قسم کا سحر آزمایا تھا کہ اس کا توڑ ہو کر نہیں دے رہا تھا۔ یہاں آتے ہی پہلی ہی رات میں نے ایک عجیب خواب دیکھا تھا۔

خواب میں کیا دیکھتا ہوں کہ میں ایک قلعے میں بیٹھا ہوں۔ نہایت عالی شان قلعہ ہے۔ اس قلعے کی منڈیر پر شیام بیٹھا مجھے گالیاں دے رہا ہے اور میں اس کی بے بسی پر مسکرا رہا ہوں۔ وہ کہہ رہا ہے۔ ''مجھے بھی دیکھنا ہے' تم کب تک بچے رہتے ہو؟ ہوٹل سے بھاگ کر تم نے سمجھ لیا ہے کہ میں تمہارا پیچھا چھوڑ دوں گا۔'' اس کے بعد میری آنکھ کھل گئی تھی۔

میں سمجھ گیا تھا کہ یہ گھر میرے لیے قلعہ ہے اور میں یہاں پوری طرح محفوظ ہو گیا ہوں۔ اس رات بھی میں لیٹے لیٹے یہی سوچ رہا تھا کہ میں کیسے اور کس طرح خود کو اس سحر سے آزاد کراؤں؟ تبھی میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ مجھے یاد آ گیا کہ مجھے ایک اجنبی نے جس نے اپنا عجیب سا تعارف کرایا تھا۔ بقول اس کے کہ وہ جن زادہ ہے اور اسے کسی پیر دمڑیا شاہ نے بھیجا ہے اور پیر دمڑیا شاہ میری مدد کرنا چاہتے ہیں۔

پیر' اولیاء' قلندر' ابدال' سب کا اپنا اپنا علاقہ ہوتا ہے۔ وہ علاقے کا بے تاج بادشاہ

ہوتا ہے۔ اس کی اجازت کے بغیر کوئی دوسرا ولی' قلندر' ابدال دخل اندازی نہیں کرتا۔ میں نے کسی کتاب میں پڑھا تھا کہ پانی پت جسے ''قلندروں کی سرزمین'' کہا جاتا ہے' وہاں گھومتے ہوئے حضرت بوعلی قلندرؒ پہنچ گئے۔ پہلے سے موجود قلندر نے انہیں اپنے ایک عقیدت مند کے ہاتھ پانی سے بھرا کٹورا بھیجا۔ یہ ایک پیغام تھا۔ پانی سے بھرا کٹورا دیکھ کر حضرت بوعلی شاہ قلندرؒ مسکرا دیے اور انہوں نے کٹورا لینے کی بجائے اس کے پانی پر ایک پھول رکھ کر کہا۔ ''اپنے قطب کو دے آؤ!'' قلندر نے پانی پر تیرتا پھول دیکھا تو مسکرا دیے۔ عقیدت مندوں نے استفسار کیا تو بولے۔ ''یہ بڑا ہٹ دھرم ہے۔ یہاں سے نہیں جائے گا۔''

''آپ نے کیسے سمجھا؟'' عقیدت مندوں نے پوچھا۔

''معمولی سی بات ہے۔ میں نے پانی سے لبریز کٹورا اس لیے بھیجا تھا کہ وہ سمجھ جائے کہ جس طرح کٹورے میں خالی جگہ نہیں ہے' اسی طرح یہ علاقہ بھی خالی نہیں ہے۔ جواب میں بوعلیؒ نے کہا کہ جس طرح پانی پر یہ پھول تیر رہا ہے' اسی طرح میں بھی تمام قلندروں' ابدالوں اور قطبوں کے درمیان تیرتا رہوں گا۔''

حضرت بوعلی شاہ قلندرؒ نے عرصۂ دراز تک خوشنودیٔ خدا کے لیے طویل عبادت کی۔ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے بیس سال تک پانی پر کھڑے ہو کر ورد کیا تھا۔ حکمِ خداوندی سے ایک فرشتہ' آدمی کی صورت میں آ کر بولا تھا کہ آپ کی عبادت قبول ہوئی۔ جو مانگنا ہے' مانگ لیجیے!

حضرت بوعلی شاہ قلندرؒ نے کہا تھا۔ ''اللہ تعالیٰ نبوت دے نہیں سکتا کہ ہمارے نبی حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آخری نبیؐ تھے۔ امامت دے نہیں سکتا کہ وہ بٹ چکی ہے۔ مجھے نبی نہیں بنا سکتا۔ حضرت علیؓ نہیں بنا سکتا تو مجھے حضرت علیؓ کی خوشبو دے دے!''

بس اسی دن سے اُنؒ کے بدن سے حضرت علیؓ کی خوشبو آنے لگی تھی اور وہ ''حضرت بو علی شاہ قلندر'' کے نام سے مشہور ہو گئے۔ جب اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کر کے ایک ابدال' قطب بارہ سو سال قبل اس جہان سے گزر جانے والے حضرت علیؓ کی خوشبو حاصل کر سکتا ہے تو میں عبادت کے زور پر اس بدبخت شیام کو شکست کیوں نہیں دے سکتا جبکہ اس علاقے کے قطب پیر دمڑیا بھی میری مدد پر تیار ہیں۔

اس خیال کے آتے ہی میں نے پیر دمڑیا شاہ کو دل ہی دل میں پکارنا شروع کر دیا۔

کسی کو بھی دل سے پکارا جائے تو اس کا جواب ضرور آتا ہے۔ بس لمحہ بھر کی دیر تھی کہ وہی اجنبی بند کمرے میں آ موجود ہوا۔ اس نے میرے قریب آ کر کہا۔ ''کیوں بھائی' کس لیے عبادت میں خلل ڈال رہے ہو؟''

''میں کس کی عبادت میں خلل ڈال رہا ہوں؟'' میں نے حیرت بھرے انداز میں پوچھا۔

''قطب الاقطاب حضرت پیر دمڑیا شاہ کی عبادت میں مسلسل خلل ڈال رہے ہو۔ انہیں پکارے جا رہے ہو۔ بولو کیا کام ہے؟''

''جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے کہ تم ہی نے بتایا تھا کہ شجاع گنج پُل کے نیچے' ریلوے لائن کے کنارے پیرؒ جی کا مزار ہے۔ ایک مُردے کا عبادت سے کیا علاقہ؟''

''بے وقوف انسان' یہ زندگی کس شمار قطار میں آتی ہے؟ انسان جب ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے تو سمجھ لو کہ وہ ''امتحان گاہ'' میں آ گیا ہے۔ جس نے اصل امتحان کے لیے اپنی زندگی میں مکمل تیاری کر لی' اسے انعام تو ملتا ہی ہے' بونس میں موقع بھی مل جاتا ہے کہ مزید عبادت کر کے رزلٹ کو اور بہتر کر لے تاکہ روزِ حساب نامۂ اعمال بہتر سے بہتر رہے اور جو اپنی زندگی میں آسانیوں کو سب کچھ سمجھ لیتا ہے' عبادت سے دور بھاگتا ہے' اسے مزید موقع تو درکنار' عذاب ہی اس کا مقدر ہوتا ہے۔ ہمارے قطب کو بھی موقع ملا ہوا ہے اس لیے نہ صرف اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے رہتے ہیں بلکہ خلقِ خدا کی مدد بھی کرتے رہتے ہیں تاکہ اضافی مارکس بھی حاصل ہوتے رہیں۔ میری بات سمجھ رہے ہو ناں؟ تمہاری ہی زبان میں بول رہا ہوں۔''

''ہاں' ہاں! سب سمجھ گیا۔ اب یہ بتاؤ کہ رانی کی بے ہوشی کیسے ٹوٹے گی؟''

''بہت آسان ہے۔ اللہ تعالیٰ کو وکیل کرو۔ اللہ تعالیٰ کا ایک صفتی نام ''اَلو کیلُ'' بھی ہے۔ اس نام کا وِرد کرتے ہوئے اس پر پھونک مارتے رہو۔ شاید اللہ تعالیٰ کو رحم آ جائے اور وہ وکیل بن کر سحر کو باطل کر دے۔''

''اور اس شیام سے کیسے نمٹا جائے؟''

''ایک وقت میں ایک کام۔ پہلے رانی پر سے سحر ختم کراؤ' تب میں دوسرے کی

ترکیب بتاؤں گا۔'' اس نے مسکرا کر کہا۔

''میں کوشش کرتا ہوں۔'' کہہ کر میں نے دھرم سنگھ پر نظر ڈالی۔ وہ ہنوز بے خبر تھا۔ اس کے خراٹے گونج رہے تھے۔ میں نے دونوں کمروں کے بیچ والا دروازہ کھولا اور رانی کے کمرے میں داخل ہو گیا۔

رانی کے چہرے پر معصومیت پھیلی ہوئی تھی۔ وہ پہلے ہی کی طرح نیم بے ہوشی کی حالت میں بستر پر پڑی تھی۔ وہی لڑکی جس کی کھلکھلاہٹ سے میں جھنجلا جایا کرتا تھا' اب اس کی آواز تک سننے کے لیے ترس رہا تھا۔ میں نے افسوس بھری نظر سے اس کا جائزہ لیا اور ''اَلو کیلُ'' کا وِرد کرنے لگا۔

واقعی اللہ تعالیٰ کے نام میں کتنا جذب ہے' مجھ پر عجیب سی کیفیت چھانے لگی تھی۔ میں آہستہ آہستہ جذب و مستی کے گرداب میں خود کو گردش کرتے محسوس کرنے لگا تھا۔ نس نس میں مستی سی دوڑتی ہوئی محسوس کر رہا تھا۔

میں وِرد کرتا رہا اور اس پر پھونک مارتا رہا تبھی ایسا لگا جیسے رانی کے چہرے میں ہلکی ہلکی تبدیلی پیدا ہو رہی ہو۔ وہ نحوست' کرختگی جو نظر آنے لگی تھی' آہستہ آہستہ غائب ہو رہی ہے۔ اس کی جگہ معصومیت لیتی جا رہی ہے۔ وہی معصومیت جو اس کی پہچان تھی۔ پھر یکایک اس نے آنکھیں کھول دیں اور نحیف آواز میں بولی۔ ''میں...... میں کہاں ہوں؟''

''اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ تمہیں ہوش آ گیا ہے۔ چلو' دھرم کے پاس چلتے ہیں۔'' کہہ کر میں نے اسے اٹھنے کے لیے سہارا دیا اور دوسرے کمرے میں آ گیا۔

دھرم سنگھ کے خراٹوں سے وہ کمرا ابھی تک گونج رہا تھا۔ میں نے اس کے کھلے ہوئے لمبے لمبے بالوں کو پکڑ کر جھٹکا دیا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ ''کیا ہوا ہے؟''

''ادھر دیکھو۔'' میں نے رانی کی طرف اشارہ کیا۔

''ارے' یہ کیا...... میری رانی کو ہوش آ گیا۔'' اس کے لب و لہجے سے خوشی ٹپک رہی تھی۔

میں نے دھرم سنگھ سے کہا۔ ''اوئے' پہلے اسے کچھ کھانے کے لیے دے۔ یقیناً بھوک لگی ہو گی۔''

''اتنی رات کو میں باہر نہیں جا سکتا کیونکہ میں سکھ ہوں اور یہ علاقہ محمڈن (مسلمانوں)

کا ہے۔خوامخواہ لوگ شک کریں گے۔تم خود چلے جاؤ۔''

بھارت آنے کے بعد سے میں نے محسوس کیا تھا کہ یہاں کے لوگ جلدی سونے کے عادی ہیں۔بمبئی' دہلی وغیرہ جیسے بڑے شہروں کی بات اور ہے۔چھوٹے شہروں میں جلدی رات اتر آتی ہے۔میں نے یہاں آ کر شلوار قمیض کی جگہ کرتہ پاجامہ پہننا شروع کر دیا تھا کیونکہ شلوار قمیض خال خال ہی نظر آتا تھا اور اسے یہاں ''نوری' ڈریس'' کہتے تھے۔ دراصل فلم ''نوری'' سے اسے مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔میں نے کرتہ پاجامہ پہنا اور باہر نکل آیا۔سامنے ہی ایک چائے خانہ تھا جہاں خالص دودھ کی چائے ملتی تھی۔میں نے اس کی دکان پر پہنچ کر اسے سلام کیا تو وہ مسکرا کر بولا۔''کہیے مہمان جی' کڑک سپریم چائے پلاؤں؟''

''بھائی' تین چائے بھیج سکتے ہو؟''

''کہاں منصور بھائی کے گھر؟ ضرور' ضرور۔'' کہہ کر اس نے چھوٹی کیتلی میں چائے کے لیے بڑی پتیلی سے گرم پانی بھرا اور چائے پتی ڈال کر چائے بنانے لگا۔

''ہاں' ساتھ میں خستہ بسکٹ بھی بھیج دینا۔'' کہہ کر میں نے اسے پانچ کا نوٹ دیا اور کمرے میں لوٹ آیا۔

رانی اور دھرم سنگھ ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔دونوں ہی خوش تھے۔اتنی دیر میں چائے والے کا لڑکا چائے دے گیا بسکٹ اور چائے سے بھوک مٹا کر رانی' دھرم سنگھ کے پاس آ بیٹھی۔

''یار دھرم سنگھ' تم اس سے اب شادی کر لو۔''میں نے کہا۔

''اس کا باپ مجھے روسٹ کر کے کھا جائے گا۔'' دھرم سنگھ نے مسکرا کر کہا۔

''بات مذاق میں مت ٹالو۔میں جس کام سے آیا ہوں' اس میں پتا نہیں' کتنا وقت لگ جائے اس لیے یا تو اسے واپس کر دو یا اس سے شادی کر لو۔''

''واپس تو نہیں کر سکتا۔ہاں' شادی کر سکتا ہوں۔''

''میں صبح منصور سے پوچھوں گا کہ یہاں گوردوارہ کہاں ہے تاکہ تمہیں ایک دوسرے سے بندھوا دوں۔'' میں نے ہنس کر کہا اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔رانی کو برابر والے کمرے میں بھیج دیا تھا اور اپنی چار پائی کھینچ کر دروازے سے لگا دی تھی کہ کہیں دونوں

''شرارت'' نہ کر بیٹھیں۔

ابھی میری آنکھ لگی تھی کہ باہر سے تیز تیز بولنے کی آواز آنے لگی۔میں نے دروازہ کھول کر دیکھا۔باہر تین سائیکل رکشا نظر آئے۔ان رکشاؤں پر پردے کے لیے چادریں بندھی تھیں۔یہ مسلمانوں کی پہچان تھی۔مسلمان گھروں کی عورتیں رکشے پر تبھی بیٹھتی تھیں جب پردے کے لیے چادریں باندھ دی جاتی تھیں۔یقیناً منصور کے ہاں کوئی مہمان آیا تھا۔میں نے دروازہ بند کر لیا اور پھر سے چار پائی پر آ کر بیٹھ گیا۔سامنے والی چار پائی پر نظر پڑی تو بری طرح چونک اٹھا۔دھرم سنگھ غائب تھا۔کہاں گیا ہوگا' یہ سوچتا ہوا میں اٹھ کر باہر آ گیا۔سامنے ہی ایک دکان تھی۔میں اسی دکان کی طرف بڑھتا چلا گیا۔میں نے دکاندار سے پوچھا۔''بھائی صاحب' آپ نے ابھی کسی سکھ کو جاتے دیکھا ہے؟''

''آپ منصور بھائی کے مہمان ہیں ناں؟'' اس نے کہا۔

''جی ہاں۔''

''میں نے آپ کے ساتھی کو اس طرف جاتے دیکھا ہے۔'' دکاندار نے جواب دیا۔

میں اسی طرف چل پڑا۔مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ وہ بغیر بتائے سڑک کی طرف کیوں چلا گیا ہے؟

تقریباً ڈھائی تین فرلانگ کے بعد سڑک تھی۔وہی سڑک جو ناتھ نگر سے شہر کی طرف آتی ہے۔میں دھیرے دھیرے چلتا ہوا سڑک تک پہنچ گیا تھا مگر دھرم سنگھ نظر نہیں آیا تھا۔میں یونیورسٹی کے نزدیک پہنچا ہی تھا کہ مجھے دھرم سنگھ نظر آ گیا۔وہ سڑک کنارے' نالے کے نزدیک آڑا ترچھا پڑا ہوا تھا۔

'اسے ہوا کیا ہے؟' یہی سوچ کر میں نے قدم تیز کر دیے۔ابھی میں اس کے نزدیک پہنچا ہی تھا کہ مجھے ایسا لگا جیسے کسی نے میری گدی پر کرارا ہاتھ مارا ہو۔میں منہ کے بل گرا تھا کہ دوسری ضرب پڑی۔اس ضرب نے آنکھوں میں ستارے سے بھر دیے۔جھلملاتے ستارے۔کھوپڑی میں سورج سا طلوع ہو گیا تھا۔میں نے بے ہوش ہونے سے پہلے ایک آواز سنی تھی۔کوئی کسی سے کہہ رہا تھا۔''اسے گاڑی میں بٹھاؤ۔وقت کم ہے۔اگر یہ شبھ گھڑی نکل گئی تو اگلے چندرما تک انتظار کرنا پڑے گا۔''

جب مجھے ہوش آیا تو میں بری طرح چونک گیا کیونکہ بے ہوش ہوا تھا سڑک کنارے

اور اَب میں ایک ایسے کمرے میں پڑا تھا جس کا فرش اکھڑا ہوا تھا۔ دیواروں کا پلاستر بھی اکھڑا ہوا تھا۔ اس کمرے کو میں نے پہلی ہی نظر میں پہچان لیا تھا کہ یہ اسی حویلی کا کمرا تھا جس کی چاہت مجھے دشمنوں کے اس ملک میں کھینچ لائی تھی۔ یہ ہماری پشتنی حویلی کا ایک حصہ تھا۔ اس خیال کے آتے ہی میں جھٹکے سے اٹھ بیٹھا کیونکہ یہ بات میرے علم میں تھی کہ اب یہ حویلی بھوتوں کا مسکن ہے۔ 1947ء کے فسادات میں بہت سارے مسلمان اس حویلی میں یہاں پناہ لینے آئے تھے اور یہاں انہی پناہ لینے والوں کا قتلِ عام ہوا تھا اور ان کی ارواح آج بھی یہاں بھٹک رہی ہیں۔ اس علاقے کی دہشت کی وجہ سے شیام نے بھی اس حویلی کو اپنا اکھاڑا بنا رکھا ہے۔ مجھے یہاں لانے والا بھی شیام ہی ہوگا' یہ سوچ کر میں کھڑا ہوگیا اور ایک کمرے میں جھانکنے لگا۔

حویلی جتنی بڑی تھی' اتنے ہی اس کے کمرے تھے اور تمام کے تمام کمرے مخدوش ہو چکے تھے۔ پلاستر جھڑ چکے تھے۔ اندر سے اینٹیں بھی کھسکی ہوئی تھیں۔ میں ایک کے بعد ایک کمرے کا جائزہ لیتا ہوا بڑھ رہا تھا کہ کسی کے بولنے کی آواز سنائی دی۔ میں اسی کمرے کی طرف بڑھنے لگا۔ اس کمرے کے دروازے پر پہنچتے ہی میں چونک گیا۔ اندر صرف شیام تھا جو ایک بڑی سی مورتی کے سامنے جھکے ہوئے امداد کی بھیک مانگ رہا تھا۔

تبھی میں نے اسے للکارا تھا کہ شیام کی کرخت آواز کمرے کے در و دیوار سے ٹکراتی ہوئی ابھری۔ ''مورکھ' جہاں ہے' وہیں تھم جا۔ اگر منڈل میں آیا تو جل کر بھسم ہو جائے گا۔''

میں جوش میں ہوش کھو بیٹھا تھا۔ منڈل کو بھی فراموش کر دیا تھا۔ اس نے احساس دلایا تو میرے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے۔ منڈل (دائرہ نما حصار) کچھ قدم کی دوری پر تھا اور وہ اسی منڈل کے درمیان بیٹھا جاپ (ورد) کر رہا تھا۔ میری نظریں اسی پر جمی ہوئی تھیں۔

''اس سے چلا جا یہاں سے۔'' شیام نے حقارت اور بے زاری کے ملے جلے تاثرات چہرے پر بکھیرتے ہوئے کہا۔

''تمہاری آگیا (حکم) کا پالن (پورا کرنا) میرا دھرم (فرض) ہے مگر اس سے نہیں کیونکہ تم مجھے خود لے کر آئے ہو۔''

''تم نے بہت شکتی (قوت) ارجن (حاصل) کر لی ہے ناں' وہ سب چھین کر تمہیں پاکستان بھیج دوں گا۔''

شیام کے تیور پہلے سے زیادہ خطرناک ہوگئے تھے۔ چند ثانیئے تک وہ مجھے نفرت بھری نظروں سے گھورتا رہا پھر اس نے اپنی شعلہ اگلتی آنکھوں کو بند کر لیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ پھر سے اپنے گیان دھیان میں مگن ہوگیا ہوگا۔ منڈل کے اندر میں اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ اسے باہر بلانا ضروری تھا۔

ابھی میں اسی پر غور کر رہا تھا کہ اس نے دوبارہ اپنی آنکھیں کھول دیں۔ اس کی شعلہ بار آنکھوں میں خون کی سرخی پہلے سے زیادہ شدید نظر آ رہی تھی۔ تیور بھی انتہائی خطرناک ہو چکے تھے۔ میں سمجھ گیا کہ اس نے آنکھ بند کر کے اپنے بیروں (موکلوں) کو آہوان (آواز دی) کیا ہے۔ میں نے جلدی سے کہا۔ ''کیوں مہاراج! مجھ سے ڈر گئے کیا؟''

شیام مجھے گھورتا ہوا اپنا آسن (ورد) چھوڑ کر کھڑا ہوگیا۔ قد و قامت اور جسامت میں وہ دیوزاد لگ رہا تھا۔ میرا اور اس کا مقابلہ شیر اور بکری کا مقابلہ تھا۔

اگر اس وقت میری جگہ کوئی اور ہوتا تو دُم دبا کر بھاگ جاتا لیکن میں نے اس کے تن و توش کا کوئی اثر قبول نہیں کیا۔ میرے پاس ایسی کوئی خاص قوت نہیں تھی۔ صرف اسمِ الٰہی کی ایک دُعا تھی اور اِسی دُعا پر بھروسا تھا۔ شیام کو زیر کر لینے کے بعد میرا تین حصے کام ہو جاتا۔ میری راہ میں کوئی اور بڑی رکاوٹ نہ رہتی:

چند ثانیوں تک ہم دونوں ایک دوسرے کو عقابی نظروں سے گھورتے رہے پھر شیام نے سپاٹ آواز میں کہا: ''مورکھ! (بے وقوف) میرا کہا مان' تیری مکتی اسی میں ہے کہ میری آگیا کا پالن کر اور اس وقت تو اس استھان سے چلا جا۔ جہاں تجھے بٹھایا ہے' وہیں جا کر انتظار کر۔''

''میں تمہاری آگیا کا پالن کرنے کو تیار ہوں' پرنتو (لیکن) پہلے تمہیں منڈل سے باہر آنا ہوگا۔'' میں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

''پاپی پاکستانی!'' شیام کے چہرے کی کرختگی دو چند ہوگئی۔ وہ سرد آواز میں بولا۔ ''تُو نہیں جانتا کہ میں اس سے کس کا جاپ کر رہا ہوں۔ اگر تُو نے میرے جاپ کو بھنگ (توڑا) کیا تو بہت برا ہوگا۔ تجھے میں جو سزا دینے والا ہوں' اس میں اضافہ ہی ہوگا اور تیری آتما بھی پچھتاتی رہے گی۔'' شیام نے تیز آواز میں کہا۔

''اس کا فیصلہ آنے والا سمے کرے گا کہ کسے پچھتانا پڑے گا۔'' میں نے شیام کو غصہ

دلاتے ہوئے کہا۔ ''اگر تم سچ مچ مہان شکتی کے مالک ہو تو مرد بنو اور منڈل سے باہر آ کر بات کرو۔''

''کمینے! تُو شیام جی مہاراج کے منہ آ رہا ہے۔ کیا تجھے اپنے جیون سے کوئی پیار نہیں ہے؟'' شیام غصے سے کانپنے لگا تھا۔

''شیام!'' اچانک میں نے اسے للکارا۔ ''میں دیکھ رہا ہوں کہ تم سے برباد کر رہے ہو۔ اتنا یاد رکھنا کہ تمہارے دن اب پورے ہو چکے ہیں۔ تم یہ سمجھ رہے ہو کہ میری چیز تم ہڑپ کر لو گے۔ مجھے واپس پاکستان بھیج دو گے' تو یہ تمہاری بھول ہے۔ تم میرے چرنوں میں اپنا سر رکھ کر دیا کی بھیک مانگو گے۔''

میرا جواب سن کر شیام سرتاپا کانپنے لگا۔ اس کا غصہ اپنے شباب پر تھا۔ اس کی خون اگلتی آنکھیں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ ایک لمحے تک وہ کھڑا پیچ و تاب کھاتا رہا پھر کڑک کر بولا۔ ''اپرادھی! میں آخری بار کہتا ہوں کہ اس سے تُو چلا جا۔ مجھے جاپ پورا کرنے دے۔ میں اس پوتر استھان کو تیرے گندے خون سے پلید نہیں کرنا چاہتا۔''

''میں پوچھ سکتا ہوں کہ تم مجھے جیون دان کس کارن دے رہے ہو؟''

''صرف اپنا جاپ پورا کرنے کے لیے' میں اس سے اپنا آدھا جاپ مکمل کرنا چاہتا ہوں کیونکہ موت تو یوں بھی تیرا مقدر بن چکی ہے۔''

''اگر تجھے خود پر اتنا ہی گھمنڈ ہے تو منڈل سے باہر آ کر بات کر۔''

میرا وار کامیاب ٹھہرا اور وہ تلملا کر منڈل سے باہر آ گیا پھر بولا۔ ''لے' میں باہر آ گیا ہوں۔''

میں اسی وقت کا منتظر تھا۔ میں نے پھرتی سے تسبیح جیب سے نکالی اور ہاتھ میں لے کر اسے جھلاتے ہوئے ''اسم اعظم'' والی دُعا پڑھی۔ لیکن شیام غالباً منڈل سے باہر آتے وقت محتاط ہو چکا تھا۔ اس نے جھلا کر اپنا سیدھا پیر زمین پر مارا تو دہکتی ہوئی آگ کے خطرناک شعلے نمودار ہوئے اور مجھے جھلسا دینے کے لیے آگے بڑھے۔ میں نے دل ہی دل میں پیر دمڑی شاہ کو آواز دی۔ میں وسیلے کے ذریعے اس پر فتح پانا چاہتا تھا۔ شاید اسی لیے اس آگ نے مجھے جھلسانے سے پہلے ہی دم توڑ دیا تھا۔ پھر میں نے وہی دُعا دوبارہ پڑھی اور اس کی طرف پھونک ماری' اور دل ہی دل میں کہا۔ ''اے زمین! تجھے قسم ہے' تو اس گناہ کی پوٹ کو

نگل لے!''

زمین فوراً پھٹی اور وہ اس میں زندہ دفن ہو جاتا کہ وہ ہوشیار ہو گیا۔ بس ایک پل کے لیے لڑکھڑایا پھر ہوا میں بلند ہو گیا۔ مجھے اس کی توقع نہیں تھی۔ شیام نے مجھے سنجیدہ دیکھ کر ہنستے ہوئے کہا:

''مورکھ' میں پاکستانیوں کے جھانسے میں نہیں آنے والا۔ پورے بھارت میں ایک بھی شخص ایسا نہیں ہے جو مجھے فتح کر سکے۔ تُو تو ابھی بچہ ہے۔''

میں نے جھلا کر تابڑ توڑ حملے شروع کر دیئے مگر وہ بھی کم چالاک نہ تھا۔ ایک کے بعد ایک حملے سے خود کو بچاتا چلا گیا۔

مجھے اب اپنی حماقت پر غصہ آنے لگا تھا۔ یہ احساس ہو چکا تھا کہ میں نے حملہ کرنے میں جلد بازی کی ہے۔ مایوسی کی وجہ سے میری حالت اَبتر ہو گئی تھی۔ میں سرتاپا پسینے میں شرابور ہو رہا تھا۔

شیام نے میری کیفیت دیکھی تو میرا مضحکہ اڑاتے ہوئے بولا: ''کیا بات ہے پاکستانی پہلوان' تم مجھے کچھ بیاکل دکھائی دے رہے ہو۔ کیا تمہاری ساری شکتی ختم ہو گئی؟ اسی شکتی کے بھروسے پر پاکستان سے آئے تھے۔''

میں غصے سے تلملا کر رہ گیا۔ قبل اس کے کوئی جواب دیتا' شیام نے پھر کہا:

''اگر آ گیا ہو پاکستانی مہاراج کی تو میں بھی دو چار چمتکار دکھا دوں؟'' پھر اس نے ایک ایک لفظ کو چبا کر کہا۔ ''تیرا سمے پورا ہو چکا ہے۔ تُو نے مجھے کشٹ دینے کو جو سپنے دیکھے' وہ مٹی کے گھروندے کی طرح ڈھے گئے۔ اب میری باری ہے۔ مورکھ' میں تجھے بتاؤں گا کہ مہان شکتی کسے کہتے ہیں۔ لے سنبھل۔''

مجھے اپنی شکست کا یقین ہو چلا تھا۔ میں نے موقع کی نزاکت محسوس کر کے وہاں سے فرار کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ کسی پُراسرار اور نادیدہ قوت نے میرے قدم جکڑ لیے تھے۔ شیام سینہ تانے کھڑا مجھے قہر آلود نظروں سے گھور رہا تھا۔ اس کی خون آلود آنکھیں مجھے اپنے وجود میں چبھتی محسوس ہو رہی تھیں۔ اس کے ہونٹ تیزی سے ہل رہے تھے۔ وہ کسی خطرناک منتر کا جاپ شروع کر چکا تھا۔ میرے پاس مفر کا کوئی راستہ نہ تھا۔ موت کا بھیانک تصور میرے وجود کو پگھلا رہا تھا۔ شیام نے اپنا ہاتھ فضا میں بلند کیا اور تیزی سے میری جانب

جھٹکا۔ دوسرے ہی لمحے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں آہنی شکنجوں میں جکڑ گیا ہوں۔ میں آہستہ آہستہ زمین سے اوپر کی طرف اٹھ رہا تھا۔ میں نے ہاتھ پیر مارنے کی بہت کوشش کی لیکن مجھے شیام کے بیروں نے پوری قوت سے جکڑ لیا تھا۔ میں برابر اوپر کی جانب اٹھتا جارہا تھا۔ گھٹن کا شدید احساس مضطرب کر رہا تھا۔ میں نے ڈوبتے ذہن سے پیر دمڑیا شاہ کو پکارا کہ اگر آپ واقعی اس علاقے کے قطب ہیں تو میری مدد کریں! آپ کے شہر میں آ کر بھی میں بے سہارا ہوں۔ مجھے سہارا دیجئے!

شاید اللہ تعالیٰ کو میری بے بسی پر رحم آ گیا تھا۔ یکا یک مجھے ایسا لگا جیسے کسی نادیدہ قوت نے مجھے جھٹکے سے اپنی طرف کھینچا تھا اور جکڑن کا احساس پل بھر میں ختم ہو گیا تھا۔ میں خود کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا کہ کسی کے ہلانے سے میری آنکھ کھل گئی۔

میں نے خود کو کبیر پور میں پایا۔ منصور مجھ پر جھکا ہوا تھا۔ حیرت سے میں اٹھ بیٹھا کیونکہ ابھی کچھ ہی دیر پہلے تو میں تاراپور میں تھا۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے اطمینان کی سانس لی اور میرا سر شکر سے جھک گیا۔

مجھے میرے اللہ تعالیٰ نے بہت بڑی پریشانی سے بچا لیا تھا۔

''کیا بات ہے جناب! کچھ دیر پہلے خبر ملی کہ آپ کا ساتھی دھرم سنگھ سڑک کنارے بے ہوش پڑا ہے۔ اسے اٹھا کر لایا ہی تھا کہ اطلاع ملی کہ آپ گھر کے پچھواڑے بے ہوش پڑے ہیں۔ یہ سب کیا ہے؟'' منصور نے پوچھا۔

''میرے دوست! یہ ایک لمبا چکر ہے۔ بس یوں سمجھ لو' حق و باطل کی جنگ چھڑی ہوئی ہے۔ کچھ نادیدہ قوتیں میرے پیچھے پڑی ہوئی ہیں جو مجھے بار بار نقصان پہنچانے کی کوشش کر رہی ہیں۔''

''وہ قوتیں کون سی ہیں؟''

''ایک کالی کا بھگت پجاری میری جان کا دشمن بنا ہوا ہے۔'' کہہ کر میں نے اپنی کہانی سنانی شروع کر دی۔ سب کچھ سننے کے بعد منصور نے حیرت و خوف بھری نظروں سے میری طرف دیکھا پھر کہا۔

''میں ایک عام سا بندہ ہوں۔ کوئی مولوی نہیں ورنہ آپ کو اس مسئلے کا حل بتاتا۔ آپ ایسا کریں' میرے ساتھ مولانا چک چلیں۔ وہاں کے گدی نشین بڑے قابل شخص ہیں

گو کہ نو عمر ہیں مگر پشتینی علم کے وارث ہیں۔ آپ کو شاید علم ہو کہ مولانا چک کی خانقاہ معمولی نہیں ہے۔ یہ خانقاہ مغلوں کے دور میں تعمیر ہوئی تھی۔ مغل شہزادہ شاہ شجاع کو دینی تعلیم کے لیے یہاں بھیجا گیا تھا۔ اس شہزادے کی قبر اب بھی شجاع گنج بازار کے قلب میں ہے۔''

''اچھا!'' میں نے دلچسپی لینے کے انداز میں کہا جبکہ حقیقت یہ تھی کہ اس کی باتوں سے مجھے اکتاہٹ ہو رہی تھی۔ وہ خواہ مخواہ تاریخ بیان کر کے اپنی بات کو لمبا کرتا چلا جا رہا تھا۔

''جی ہاں! اس خانقاہ کی ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ اس کے دروازے پر ایک سیاہ رنگ کا کراماتی پتھر ہے۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ اس علاقے میں سانپ بکثرت پائے جاتے ہیں۔ اسی قدر سانپ کے کاٹنے کے واقعات رونما ہوتے ہیں۔ جسے بھی سانپ کاٹے' خواہ وہ مسلمان ہو یا ہندو' اسے یہاں لایا جاتا ہے۔ جیسے ہی وہ اس پتھر کو پھلانگ کر کنویں پر پہنچ کر نہا لیتا ہے' اس کے جسم سے زہر کا اثر اتر جاتا ہے۔ اس کرامت نے ہی اس علاقے میں اسلام پھیلانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اکثر غیر مسلم زندہ بچ جانے کی خوشی میں مسلمان ہو جاتے ہیں۔''

''ہاں' یہ تو صحیح ہے کہ ہندوستان میں تبلیغِ اسلام کے لیے جتنا کام صوفیوں نے کیا ہے' اتنا کسی اور نے نہیں۔ بادشاہان تو اپنا تخت و تاج بچانے میں ہی لگے رہتے تھے اور غیر مسلموں کو اونچے اونچے عہدوں پر بٹھا کر تبلیغ اسلام میں رکاوٹ ڈالتے تھے۔'' میں نے اس کی بات کو مختصر کرنے کے لیے کہا۔ ''تم کب مجھے اس خانقاہ میں لے جاؤ گے؟''

''صبح چلیں گے۔ میں کالج سے چھٹی کر لوں گا۔''

''ہاں' یہ ٹھیک ہے۔ صبح چل کر بات کر لوں گا۔'' کہہ کر میں نے درمیانی دروازہ جو پاٹوں پاٹ کھلا ہوا تھا' اس سے اندر کی طرف دیکھا۔ رانی اسی کمرے میں سوتی تھی۔ اس کی فرمائش پر منصور نے کرائے پر ٹی وی اور وی سی آر لا دیا تھا اور اب وہ دھرم سنگھ کے ساتھ بیٹھی فلم دیکھ رہی تھی۔ فلم دیکھنا مجھے کبھی اچھا نہیں لگا تھا۔ مجھے دادا جی کی بات یاد آ رہی تھی۔ انہوں نے ایک بار کہا تھا:

''حضورِ اکرم ﷺ نے فرمایا ہے کہ قربِ قیامت کی دلیلوں میں سے ایک دلیل یہ بھی ہے کہ گھر گھر میں عورتیں ناچیں گی۔'' اُس وقت کے لوگ شاید سمجھ نہ پائے ہوں کہ ہر گھر میں عورتیں کیسے ناچیں گی؟ مگر آج ٹی وی کے آ جانے پر پتا چل رہا ہے کہ واقعی اب قیامت

قریب ہے۔ گھر گھر میں ناچ رنگ کی محفل دکھائی دے رہی ہے۔''

اسی لیے میں نہ تو ٹی وی دیکھتا ہوں' نہ فلم۔ منصور کی شاید فلم دیکھی ہوئی تھی کیونکہ اس نے صرف ایک بار جھانک کر فلم کا منظر دیکھا تھا پھر میرے پاس آ بیٹھا تھا۔ اس کمرے سے رہ رہ کر ان دونوں کے قہقہے سنائی دے رہے تھے کہ منصور اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ ''اچھا میں چلتا ہوں' آپ بھی آرام کریں۔''

ابھی اس نے دروازے کی طرف قدم بڑھایا ہی تھا کہ ایسا لگا جیسے باہر والے بند دروازے سے کوئی چیز ٹکرائی ہو۔ آواز خاصی زوردار تھی۔ میں نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔ وہی آواز پھر سنائی دی۔ میں نے کھڑکی کھول کر سلاخوں سے اپنا سر باہر نکالا اور دروازے کی طرف دیکھنے کی کوشش کی۔ کھڑکی ایسے زاویے پر تھی کہ دروازے کا صرف آدھا حصہ نظر آ رہا تھا پھر بھی وہ چیز نظر آ گئی جو دروازے سے ٹکرائی تھی۔ اسے دیکھ کر میں بری طرح چونک گیا۔

وہ ایک کالے رنگ کا بڑا سا پرندہ تھا لیکن کوا یا چیل نہ تھی۔ خاصا بڑا پرندہ تھا۔ وہ اچھل کر پیچھے ہٹتا۔ ہوا میں کچھ دور تک بلند ہوتا اور جس طرح بمباری کے لیے فائٹر طیارے غوطہ لگاتے ہیں' بالکل اسی طرح وہ بھی غوطہ لگا کر دروازے پر حملہ آور ہوتا' پوری قوت سے ٹکراتا۔ ہر ٹکر پر دروازہ لرز جاتا۔

اس آواز نے دھرم سنگھ کو بھی چونکا دیا تھا۔ اس نے ٹی وی' وی سی آر بند کر دیا تھا اور میرے پاس آ گیا تھا۔ رانی بھی وہیں آ گئی تھی۔ ہم چاروں کھڑے تعجب بھری نظروں سے دروازے کو دیکھ رہے تھے۔ منصور کی آنکھوں سے خوف جھلک رہا تھا۔ رانی اور دھرم سنگھ تو ایسے منظروں سے آشنا تھے اس لیے ان کی آنکھوں میں صرف فکرمندی تھی۔ تقریباً سبھی نے باری باری جھانک کر پرندے کو دیکھ لیا تھا۔

''یہ...... یہ کیا چیز ہے بھائی؟'' منصور نے خوف زدہ لہجے میں پوچھا۔

''میری سمجھ میں تو کچھ بھی نہیں آیا ہے۔'' میں نے اپنا دامن چھڑانے کے لیے کہا۔

ٹھیک اسی وقت دروازے پر پڑنے والی ضرب کی آواز مزید بلند ہو گئی کیونکہ دروازہ جو موٹی لکڑی کا تھا' وہ تقریباً ایک فٹ تک پھٹ گیا تھا۔ وہ رخنہ چوڑائی میں دو ڈھائی انچ تو ضرور ہو گا۔ اس رخنے سے باہر کے لیمپ پوسٹ کی روشنی اندر تک آنے لگی تھی۔ تبھی ایک

اور ضرب پڑی۔ اس پرندے کی چھ انچ لمبی چونچ نے رخنے کو مزید وسیع کر دیا تھا۔

''جس پرندے کی چونچ میں اتنی طاقت ہے کہ اتنے مضبوط دروازے کو توڑ دے' وہ اگر ہماری کھوپڑی پر وار کرے تو یقیناً کھوپڑی بھی چیخ جائے گی۔'' دھرم سنگھ نے ہنس کر کہا۔

''بھائی' ایسی خوف ناک باتیں تو نہ کرو۔'' منصور سہمی ہوئی آواز میں بولا۔

''یہ بالکل صحیح کہتا ہے۔ اب تمہاری کھوپڑیوں کی باری ہے۔'' حیرت انگیز طور پر یہ آواز مجھے اپنے دماغ میں محسوس ہوئی۔ ہمارے آس پاس آواز کی جو لہریں (Sound Waves) ہیں' ہم انہیں کان کے ذریعے محسوس کرتے ہیں اور کان کا پردہ (Ear drum) اس کے بارے میں دماغ کو مطلع کرتا ہے۔ دماغ میں جمع شدہ کروڑوں بلکہ کھربوں اشاریوں میں سے وہ خاص اشارے سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں دماغ کے ایک حصے سے دوسرے حصے میں منتقل ہو جاتے ہیں جنہیں ہم ''سنائی دینا'' کہتے ہیں لیکن یہاں بات اُلٹ تھی۔ کان کے پردے نے کچھ بھی سنا نہ تھا۔ یہ آواز سیدھی دماغ میں گونجی تھی۔

میں نے چونک کر پرندے کی طرف دیکھا جس کی چونچ ہی نہیں' سر بھی درز سے اندر آ چکا تھا۔ صرف دھڑ باہر تھا۔ اس کی گول گول چمکتی ہوئی آنکھیں میری ہی طرف دیکھ رہی تھیں۔

''تم نے صحیح سمجھا ہے' میں ہی تم سے مخاطب ہوں۔ تم نے کیا سمجھا تھا' یہاں آ کر ہماری دسترس سے باہر رہو گے؟ تمہیں پاکستان لوٹنا ہی پڑے گا۔''

میری نگاہ کمرے کی دیوار پر رک گئی اس لیے کہ دیوار پر فریم شدہ طغریٰ ٹنگا ہوا تھا۔ اس فریم میں آیاتِ ربانی تھیں۔ پھر بھی یہ یہاں تک کیسے آ گیا؟ میں یہی سوچ رہا تھا کہ وہی آواز پھر دماغ میں گونجی۔ ''تمہارے دھرم کے سب اصول سچے ہیں جبھی تو ہم دور دور رہتے ہیں۔ یہ تو ہماری خوش قسمتی ہے کہ تم لوگ خود ہمیں راستہ دے دیتے ہو۔ جب تک اس گھر میں نماز' تلاوتِ قرآن پاک ہوتی رہی' ہم ناکامی جھیلتے رہے۔ دو دن تک اِدھر اُدھر چکر لگاتے رہے لیکن جیسے ہی اس گھر سے ناچ گانے کی آواز بلند ہوئی' اچھے اثرات زائل ہو گئے اور ہمیں آنے کا راستہ مل گیا۔''

• مجھے یاد آ گیا کہ ایک بار حضرت عمرؓ کی نظر حضرت عبداللہؓ ابن زبیر کی نظر چھوٹی بچی پر پڑی جو غلام کے ساتھ آپؓ ہی کی خدمت میں آ رہی تھی۔ ابھی وہ دور تھی کہ حضرت عمرؓ نے غلام کو رک جانے کا اشارہ کیا۔ جب غلام رک گیا تو آپؓ خود اس کے پاس پہنچے اور فرمایا۔

''کیا تو نے نہیں سنا ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا۔ ''ہر گھنگھرو کے ساتھ ایک شیطان بندھا ہوتا ہے۔'' اور اس بچی کے پیروں سے گھنگھرو کھول کر پھینک دیے تھے۔

ہمارے پاس ہر سوال کا جواب موجود ہے۔ ہر اچھائی' برائی کے بارے میں ہمیں خوب بتا دیا گیا ہے' پھر بھی ہم اپنے ہی پیروں پر کلہاڑیاں چلا لیتے ہیں۔ کاش' دھرم سنگھ کے کہنے پر وی سی آر نہ منگواتا! لیکن اب کیا ہو سکتا تھا' اس لیے ہم خاموش رہ گئے۔

''ہاں' تو کیا کہتے ہو' تمہارے سر پر چونچ ماروں؟'' یہ آواز پھر میرے دماغ میں گونجی۔ میں نے پھرتی سے اپنی جیب میں رکھی تسبیح کو نکالا اور دُعائے اسمِ اعظم پڑھتے ہوئے اس کی طرف جھٹکا دیا۔ یہ اتفاق کی بات ہے کہ وہ تسبیح میرے ہاتھ سے چھوٹ کر اس کی چونچ سے ٹکرائی۔ تسبیح کے ٹکرانے سے ایسا لگا جیسے قیامتِ صغریٰ آ گئی ہو۔ ایسا شدید دھماکا ہوا تھا کہ میں بتا نہیں سکتا۔ یقیناً آس پاس کے مکانات کے در و دیوار بھی کانپ اٹھے ہوں گے۔ ہم سب ہل کر رہ گئے تھے۔ دھرم سنگھ اور رانی منہ کے بل گر گئے تھے۔

وہ دونوں دوسرے کمرے سے اس کمرے میں آئے تھے اور دروازے کے کچھ زیادہ ہی نزدیک کھڑے تھے۔ شاید اسی لیے ان پر زیادہ اثر ہوا تھا۔ دروازہ ٹوٹ کر بکھر گیا تھا۔ ہم چاروں اس خلاء کی طرف بڑھے تاکہ اس بارود بھرے پرندے کا حالِ زار دیکھ سکیں پھر ہمیں یہ بھی ڈر تھا کہ آس پاس والے بھی دوڑ پڑے ہوں گے۔

''بھائی جان! اب کیا ہوگا؟'' منصور نے رک کر کہا۔

''کس سلسلے میں؟'' میں نے پوچھا۔

''ارے بھائی' اس دھماکے پر تو پولیس والے بھی دوڑ پڑے ہوں گے۔ دھماکا مسلم ایریا میں' مسلمان کے گھر میں ہوا ہے۔ وہ فوراً الزام لگا دیں گے کہ یہاں بم سازی ہوتی ہے اور ہمیں ''ٹاڈا'' کے تحت گرفتار کر لیں گے۔''

''اللہ مالک ہے! ویسے میں تمہیں بچانے کی پوری کوشش کروں گا۔'' میں نے جھوٹی تسلی دی۔

''بھائی' آپ شاید جانتے نہیں ہیں۔ یہاں پتا بھی کھڑکتا ہے تو الزام پاکستان پر دھر دیا جاتا ہے۔ پاکٹ مار اگر پاکٹ ماری کرتے ہوئے پکڑا جائے اور وہ اتفاقاً مسلمان نکل آئے تو جانتے ہیں اس پر کون سا کیس بنتا ہے؟ پاکستانی جاسوس کا۔ پولیس والے

رپورٹ مرتب کرتے ہیں کہ ملزم تربیت یافتہ دہشت گرد تھا۔ اسے شک ہو گیا تھا کہ مذکورہ شخص کی جیب میں انتہائی حساس نوعیت کی دستاویزات ہیں۔ وہ اسے ہی نکال رہا تھا کہ پولیس نے گرفتار کر لیا۔ گرفتاری کے بعد ملزم نے بتایا کہ اسے مذکورہ شخص پر ایک انتہائی اہم شخصیت کا مغالطہ ہوا تھا۔'' منصور نے رو دینے والے لہجے میں مسلمانوں کی حالتِ زار کی تصویر کشی کی۔

''اللہ تعالیٰ مسبب الاسباب ہے۔ آؤ' پہلے باہر کا جائزہ لے لیں۔'' میں نے کہا اور ٹوٹے ہوئے دروازے سے باہر قدم نکالا۔

باہر کی حالت دیکھ کر ہم چاروں کو حیرت ہوئی کیونکہ باہر کسی قسم کی افراتفری نظر نہیں آئی تھی۔ یہاں تک کہ سامنے والی دکان پر بھی کوئی ہلچل نہ تھی۔ دو افراد کھڑے تھے جو کسی بات پر دکاندار سے بحث کر رہے تھے۔ اگر دھماکے کی آواز باہر تک پہنچتی تو یقیناً وہ لوگ اتنے اطمینان سے کھڑے نظر نہ آتے۔ یقیناً یہ دھماکا صرف ہمارے لیے تھا۔

ہم چاروں طرف سے مطمئن ہو کر واپس مڑ گئے۔ یہ جادو سحر ناممکن کو ممکن کر دکھاتا ہے۔ عقل کی کسوٹی پر پرکھا نہیں جا سکتا اسی لیے ہم میں سے کسی نے بھی حیرت کا اظہار نہیں کیا تھا لیکن جیسے ہی ہم کمرے میں لوٹے' سامنے پیر دمڑیا شاہ کے ہرکارے کو کھڑا پایا۔ اس نے مسکرا کر سلام کیا۔ پھر بولا۔

''جنابِ والا' حضرت کا حکم ہے کہ آپ کو حفاظت کا طریقہ تعلیم کر آؤں اسی لیے آیا ہوں۔''

''بھائی..... آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ ایسے عجیب و غریب حملے سے آپ ہمیں کیسے بچائیں گے؟ ادھر دیکھیے' دروازے کے پرخچے اڑ گئے۔ زبردست دھماکا ہوا۔ ہم سب لرز گئے۔ یہ دونوں زمین پر گر گئے مگر وہ آواز باہر تک پہنچی نہیں۔'' منصور نے حیرت سے کہا کیونکہ وہ پیر دمڑیا شاہ کے ہرکارے کو پہچان نہیں پایا تھا کہ سامنے والا انسان نہیں ہے۔

''تم مسلمان ہو کر بھی ناامیدی کی باتیں کرتے ہو۔ شرم آنی چاہیے۔ ارے' تم تو اپنے پاس سارے جہان کے علم کا خزانہ رکھتے ہو۔ قرآنِ پاک کو جزدان میں لپیٹ کر خود پر ظلم کرتے ہو۔ کبھی اسے کھول کر بغور پڑھو۔ سمجھنے کی کوشش کرو' پھر دیکھو کہ اس میں کس کس طرح حوصلہ افزائی کی گئی ہے۔ کون کون سی نئی راہیں بتائی گئی ہیں۔ کیسی کیسی معلومات موجود

ہیں۔''

''آپ تو بالکل مولویوں کی سی باتیں کر رہے ہیں۔'' منصور نے ہنس کر کہا۔

''لفظ ''مولوی'' کو کچھ لوگوں نے جو قرآنِ پاک کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے' وہ بدنام کر رہے ہیں کیونکہ جس نے داڑھی رکھ لی' اسلامی اصولوں پر بات کرنا شروع کر دی' اسے ہی لوگ ''مولوی'' کہنا شروع کر دیتے ہیں جبکہ مولوی قرآنِ پاک نہ صرف پڑھتا ہے بلکہ پڑھاتا اور سمجھاتا بھی ہے۔ وہی تو وارثِ قرآنِ پاک ہے اور جس کے پاس قرآن کا علم ہوگا' اس کے پاس ہر وہ علم ہوگا جس کی انسان کو ضرورت ہے۔''

''واہ جناب! آپ نے خوب کہی! کیا قرآنِ پاک میں کمپیوٹر اور ٹی وی کا بھی ذکر ہے؟'' منصور نے ہنس کر کہا۔

''شرم کرو' تم مسلمان ہو کر ایسی باتیں کر رہے ہو۔ قرآنِ پاک میں کیا نہیں ہے۔ سب سے پہلے میں یہ بتا دوں کہ آئین اسٹائن جیسے بڑے سائنس دان نے کہا تھا کہ

"Religion without Science is blind and

Science without religion is blind."

یعنی دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ سائنس انسان کے دماغ کو وسعت دیتی ہے۔ اگر سائنس احکامِ خداوندی کے نظریے کو سامنے رکھ کر پڑھی جائے تو علم کا سمندر دماغ میں سما جاتا ہے۔ عقل کے اندھوں کی طرح اسلام کو مت دیکھو۔ قرآنِ پاک کی روشنی میں سائنس پڑھو! بہت سے لوگ سوچتے ہیں کہ تیس پاروں میں سارے جہان کا علم کیسے سما سکتا ہے تو وہ یہ بھی سوچیں کہ Compact Knowledge کا زمانہ اب آیا ہے جبکہ اس کی زندہ مثال خود قرآنِ پاک ہے۔ واشنگٹن کی ''کانگریس لائبریری'' دنیا کی بڑی لائبریریوں میں سے ایک ہے۔ کروڑوں کی تعداد میں کتابیں موجود ہیں اور ان تمام کتابوں کا عکس تقریباً دو سو ڈسک میں منتقل کر لیا گیا ہے۔ جب کتابوں کی اتنی بڑی تعداد کو صرف دو سو ڈسک پر منتقل کیا جا سکتا ہے کہ جس صفحے کو دیکھنا ہے' صرف ایک بار لیفٹ اور رائٹ کلک کریں' فوراً وہ صفحہ آ گیا تو کیا اس دنیا کا خالق تمام جہان کے علم کو صرف ''الف لام میم'' میں منتقل نہیں کر سکتا ہے؟'' وہ کسی منجھے ہوئے مقرر کی طرح تقریر کر رہا تھا۔

''چلیں' مان لیا کہ تمام علم کو اللہ تعالیٰ نے قرآنِ پاک کے ایک لفظ میں سمو دیا ہے تو

ہم اسے کیسے سمجھیں گے؟'' منصور نے پوچھا۔

''حضورِ اکرم ﷺ کی سنت سے کہ آپ ﷺ نے اپنے ہر عمل سے سب کچھ سمجھا دیا ہے۔ آپ ﷺ کی تعلیمات کو جس نے سمجھا ہے' اس سے سمجھو۔ صحابہ کرامؓ' آئمہ' اولیاء اللہ' قطب' ابدال' علماء و فضلاء وغیرہ وغیرہ سے پوچھو۔ ان کی زندگی سے سمجھنے کی کوشش کرو۔ بات لمبی ہوتی چلی جائے گی اس لیے مختصراً بتا دوں کہ صاحبِ علم سے پوچھو۔ مجھے بھی علم کا ایک معمولی ذرہ ملا ہے۔ میں اسی کے مطابق سمجھانے کے لیے آیا ہوں۔''

''آپ کیا سمجھانا چاہتے ہیں؟''

''فی الحال بس اتنا کہ نماز کی پابندی کرو! تلاوتِ قرآنِ پاک کو معمول بناؤ اور ترجمے کو ضرور پڑھو! نہ صرف پڑھو بلکہ سمجھنے کی بھی کوشش کرو!''

''مگر نماز و تلاوت کا اس حملے سے کیا علاقہ؟''

''ارے بھائی' نماز پڑھنے کا مطلب ہے اللہ تعالیٰ کو مدد کے لیے پکارنا! اللہ تعالیٰ خود مدد کے لیے نہیں آئے گا مگر وسیلہ ضرور پیدا کرے گا۔ اس طرح تم وسیلے سے حفاظت کے حصار میں آ جاؤ گے۔ قرآنِ پاک کا ہر لفظ ''مدافعتی ہتھیار'' بھی ہے۔ تمہارے سامنے شیطانی قوت ہے اور تم ہر کام کی ابتداء اعوذ باللہ سے شروع کرو گے تو شیطان سے پناہ ملے گی ہی۔ اس کی قوت کا توڑ بھی ہوتا رہے گا۔''

''آپ یقین کریں' آج سے میں پابندی سے نماز بھی پڑھوں گا اور تلاوتِ قرآنِ پاک بھی کروں گا۔'' منصور نے جواب دیا۔

''چلیے' آپ کی بات مان لی۔ مجھے یہی بتانا تھا۔ اسی طرح آپ لوگ محفوظ رہ سکتے ہیں۔'' کہہ کر وہ دروازے سے باہر نکل گیا۔

''مگر بھائی میاں! تم لوگ تو نماز اور قرآنِ پاک سے محفوظ ہو جاؤ گے۔ ہم کیا کریں گے؟'' دھرم سنگھ جو اب تک خاموش تھا' فکرمند لہجے میں بولا۔

''تم مرو گے۔'' ایک اجنبی آواز سنائی دی۔ ہم [illegible] ایک ساتھ دروازے کی طرف اٹھ گئیں۔ وہاں ایک کریہہ الصورت [illegible] اس سے پہلے کہ ہم کچھ کرتے کہ اس سے پہلے ہی اس نے ہاتھ اٹھا دیا۔

ہاتھ کے اٹھتے ہی [illegible] کی پانچوں انگلیوں [illegible] سے نکلے اور دھرم سنگھ کے جسم

سے ٹکرائے۔ وہ پوری قوت سے چیخا۔

اس کی کرب میں ڈوبی چیخ سن کر ہم سب اس کی طرف دوڑے تب تک وہ زمین پر گر چکا تھا۔ اس کے جسم پر بڑے بڑے آبلے سے پڑ گئے تھے۔ پھر وہ بڑھیا' رانی کی طرف مڑی اور رانی بھی بن پانی کی مچھلی کی طرح تڑپنے لگی۔ میں اور منصور اس کی طرف بڑھے تھے کہ بڑھیا نے منصور پر وار کر دیا۔ وہ بڑھیا تھی کہ آفت کی پڑیا۔ اس نے آتے ہی بروس لی اسٹائل میں تین تین افراد کو چت کر دیا تھا۔ اب باقی تھا صرف میں۔ پھر وہ میری طرف مڑی تھی کہ میں نے زور زور سے ''قل اربعہ'' پڑھنا شروع کر دیا۔ یقین کریں' اب سے پہلے خود مجھے خبر نہ تھی کہ سورۃ قرآنی میں اتنی قوت ہے! جیسے ہی میں نے سورۃ پڑھی' اس بڑھیا نے ناک سے چیخنا شروع کر دیا۔ ''ہائیں......! جل گئیں رے......! ہائیں......! جلا ڈالاں رے......!''

میں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا۔ مزید سورۃ پڑھنے کے لیے ذہن پر زور دینے لگا مگر ہم جو سنیما دیکھ کر پورے پورے مکالمے یاد کر لیتے ہیں' گانے ازبر کر لیتے ہیں' مگر ''چار قل'' اور ایک آیت الکرسی و سورۃ فاتحہ کے علاوہ کچھ یاد نہیں کر پا رہے تھے۔ رمضان کے رمضان قرآن پاک پڑھنے والے سے اور توقع ہی کیا ہے۔ میں کچھ اور نہ پڑھ سکا تھا کیونکہ ذہن کورا کاغذ بن گیا تھا۔ میری اسی کمزوری کا فائدہ اٹھا کر بڑھیا نے ہاتھ دکھا دیا۔ پوپلا منہ اور سیاہ رنگت' جھولتی چمڑی' جھکی کمان کمر مگر ایسی قوت۔ اس نے ایک لمبی چھلانگ لگائی تھی اور کسی ماہر جمناسٹ کی طرح اس نے رانی کو دونوں ہاتھوں پر اٹھایا تھا اور باہر کی سمت دوڑتی چلی گئی تھی۔

میرا ذہن کند ہو گیا تھا۔ عقل جواب دے گئی تھی۔ میں اب کیا کروں' میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیونکہ ایک طرف منصور اور دھرم سنگھ سوختہ حالت میں پڑے کراہ رہے تھے اور دوسری طرف وہ بڑھیا' رانی کو کندھے پر اٹھائے دوڑتی چلی جا رہی تھی۔ میں اگر اس کا پیچھا کرتا ہوں تو یہ لوگ تکلیف سے جان دے دیں گے اور اگر انہیں دیکھتا ہوں تو رانی ہاتھ سے نکل جاتی ہے۔ وقت بالکل نہیں تھا اس لیے دماغ نے ایک کے مقابلے میں دو کا انتخاب کر لیا۔ میں ان دونوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا تو میں نے بزرگ کا عطیہ کراماتی تسبیح کو منصور کے سینے پر رکھا اور آیت الکرسی پڑھنے لگا۔ آیت الکرسی نے کام کر

دکھایا اور لمحوں میں منصور کے جسم پر ابھر آئے آبلے سوکھ گئے۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

اب میں نے دھرم سنگھ کی طرف توجہ مبذول کر لی اور جلدی جلدی آیت الکرسی پڑھ پڑھ کر اس پر پھونکنے لگا۔ کچھ ہی دیر میں وہ بھی بھلا چنگا ہو گیا۔ ان دونوں کے ٹھیک ہوتے ہی میرا ذہن رانی کی طرف مڑ گیا۔ اسے کہاں ڈھونڈوں' یہ بات سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ اب ایک ہی راستہ تھا کہ میں واپس تاراپور کی حویلی میں جاؤں۔ یقیناً شیام نے اسے وہیں رکھا ہوگا۔ میں ابھی یہی سوچ رہا تھا کہ وہی جن زاد پھر آ گیا۔ اس نے کہا۔ ''حضرت نے مجھے بھیجا ہے۔ تم لوگ فوراً مندار ہل چلے جاؤ۔ وہاں ایک بہت بڑا اور مشہور مندر ہے۔ اسے ''پتال گنگا کا مندر'' بھی کہتے ہیں۔ اسی مندر میں رانی کو شیام نے رکھا ہے۔ اسے امید ہے کہ تم سیدھے تاراپور کی حویلی جاؤ گے اسی لیے اس نے رانی کو الٹی طرف بھیج دیا ہے۔''

جن زاد یہ کہہ کر چلا گیا مگر مجھے مندار ہل کا پتا نہیں تھا کہ یہ علاقہ کس طرف ہے؟ میں نے منصور سے پوچھا تو اس نے کہا۔ ''ہاں' ہاں' میں جانتا ہوں۔ بس سے اگر جاؤ گے تو ''باونسی'' اتر کر پیدل جانا پڑے گا جبکہ ریل مندر کے قریب اتارے گی۔''

''ریل سے چلتے ہیں۔'' میں نے فیصلہ سنا دیا۔

''تو پھر دیر نہ کرو۔ وقت ہو چلا ہے۔ اگر یہ والی ریل نہ پکڑی تو پھر شام میں ہی دوسری ٹرین ملے گی۔'' منصور بولا۔

''تو چلو' چلتے ہیں۔'' کہہ کر میں بھی کھڑا ہو گیا۔

''واہ گرو دی سوں' میں اس شیام کے بچے کو نہیں چھوڑوں گا۔ ٹوٹے ٹوٹے کر دوں گا۔ اس نے دوسری بار میری رانی پر حملہ کیا ہے۔'' دھرم سنگھ بولا۔

ہم سب تیز تیز قدموں سے اسٹیشن پہنچے۔ ٹرین بالکل تیار کھڑی تھی۔ منصور نے صحیح کہا تھا۔ اگر ہمیں ذرا بھی دیر ہو جاتی تو ٹرین نکل جاتی۔ منصور نے ٹکٹ لیا اور ہم سب آ کر فرسٹ کلاس کے اکلوتے ڈبے میں بیٹھ گئے۔ دھرم سنگھ اور منصور خالی سیٹوں پر کمر سیدھی کرنے کا کہہ کر لیٹ گئے۔ پورا کمپارٹمنٹ خالی تھا۔ میں کھڑکی سے باہر کی چہل پہل دیکھ رہا تھا کہ ایک بارعب سی عورت قلی کے سر پر سوٹ کیس رکھے اسی ڈبے میں داخل ہوئی۔ اس نے ایک نظر میں پورے کمپارٹمنٹ کا جائزہ لیا۔ منصور اور دھرم سنگھ پر نظریں دوڑائیں پھر میرے سامنے والی سیٹ پر آ کر بیٹھ گئی۔ قلی نے سامان سیٹ کے نچلے حصے میں رکھ دیا۔

میں نے ایک نظر اس عورت پر ڈالی پھر باہر دیکھنے لگا مگر مجھے احساس ہو گیا تھا کہ وہ عورت میری ہی طرف دیکھ رہی تھی۔ مجھے اکتاہٹ سی ہو رہی تھی۔ ہر شریف نوجوان کو ایسا ہی احساس ہوتا ہے جب کوئی عورت ''بغور'' اس کی طرف دیکھے۔ جیسے ہی گاڑی نے وِسل دی' وہ عورت بولی۔ ''سنیے!''

''جی فرمائیں!'' میں نے مڑ کر کہا۔

''آپ یہاں کیسے؟'' اس نے الجھی نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''آپ مجھے پہچانتی ہیں؟'' میں نے سوال کیا۔

''آپ وجاہت علی خان ہیں ناں! نواب فراست علی خاں کے چھوٹے صاحب زادے؟''

میں چکرا اٹھا کہ پاکستان سے اتنی دور' بھارت کے ایک چھوٹے سے شہر میں مجھے پہچاننے والی یہ عورت کون ہے جو نہ صرف میرا بلکہ میرے والد کا نام بھی جانتی ہے؟ میں نے پوچھا۔ ''آپ نے اپنا تعارف تو کرایا ہی نہیں' آپ کون ہیں' مجھے کس طرح پہچانتی ہیں؟''

''اے لو' میں تمہیں نہیں پہچانوں گی۔ میں تو تمہارے گھر شیخوپورہ بھی جا چکی ہوں۔ ارے بھئی' سامنے کی بات ہے' تمہارے ابا وغیرہ تاراپور ہی کے تو تھے۔''

میں حیران تھا کہ یہ میرے بارے میں اتنا کچھ جانتی ہے پھر مجھے اس کی شکل یاد کیوں نہیں آ رہی ہے کہ میں نے اس سے کب اور کہاں ملاقات کی ہے؟

میں ابھی اسی الجھن میں تھا کہ اس عورت نے گردن آگے کر کے مجھ سے کہا۔ ''کیوں سراب کے پیچھے بھاگ رہے ہو؟ پاکستان لوٹ جاؤ۔ بھول جاؤ رانی کو ورنہ رانی کی طرح خود تمہارا اغواء یا قتل بھی ہو سکتا ہے۔''

میں سمجھ گیا کہ یہ شیام کی ہرکارہ ہے۔ اسی نے اسے بھیجا ہے۔ گویا یہ میرے لیے پیر تسمہ پا ہے تا کہ میں رانی تک پہنچ نہ پاؤں۔ میں نے خشمگیں نظروں سے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''تو گویا تم میری جاسوسی کرنے آئی ہو؟''

''جاسوسی نہیں' سمجھانے آئی ہوں۔ خیر چھوڑو ان باتوں کو' یہ بتاؤ' اب کیا ارادہ ہے؟ مندار بل جا کر ہی رہو گے؟''

''ہاں' ہاں!'' میں نے تقریباً چیخ کر کہا۔

''ارے' ارے' آہستہ بولو۔ میں بہری نہیں ہوں۔ ہاں' ذرا سر میں درد ضرور ہے۔ دبا دو گے؟''

''میں کیا تمہیں مالشیا نظر آتا ہوں؟'' میں نے جلے کٹے انداز میں کہا۔

''کوئی بات نہیں' میں اپنا سر خود بھی دبا سکتی ہوں۔'' کہہ کر اس نے سر کو دو طرف سے پکڑا اور اوپر کی طرف جھٹکا دینے لگی۔ دو تین جھٹکوں سے پہلے اس کی گردن لمبی ہوئی پھر آخری جھٹکے پر وہ ٹوٹ کر بلند ہو گئی' لیکن نہ ایک قطرہ خون بہا اور نہ اس کی چیخ بلند ہوئی۔

اس نے بڑے آرام سے اپنے سر کو سیٹ پر رکھ دیا پھر دونوں ہاتھوں سے سر کی مالش کرنے لگی۔ میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس حیرت انگیز منظر کو دیکھ رہا تھا کہ کٹے ہوئے سر کے لب ہلے اور آواز آئی۔ ''یہی کچھ رانی کے ساتھ ہونے والا ہے۔ اس کا سر بھی کٹے گا۔ بڑا مزہ آئے گا۔''

''تم مجھے مرعوب کرنا چاہتی ہو تو سن لو' میں نہ پیچھے ہٹوں گا اور نہ ہار مانوں گا۔ شیام سے کہہ دینا کہ میں اپنی امانت لے کر ہی جاؤں گا۔ رہ گیا تمہارا مسئلہ تو سن لو' میں تم سے خوف زدہ نہیں ہوں۔'' کہہ کر میں نے جھپٹ کے اس کا سر کھینچا اور چلتی ٹرین کے دروازے سے نیچے پھینک دیا۔

سر کا نیچے پھینکنا تھا کہ ایسا لگا جیسے قیامت آ گئی ہو۔ رونے' بین کرنے کی آواز سے کان کے پردے پھٹنے لگے تھے لیکن یہ وقفہ طویل ثابت نہ ہوا۔

میں نے جہاں سر کو پھینکا تھا' وہ جگہ کافی پیچھے چھوٹ گئی تھی۔ جگدیش پور کا اسٹیشن بھی گزر گیا تھا۔ گویا سر کو وہیں پڑے رہنا چاہیے تھا مگر ایک تیز سیٹی کی آواز گونجی جیسے قریب سے ہوائی جہاز گزر رہا ہو اور میری آنکھیں سکتے کی زد میں آ گئیں۔ وہ سر واپس آ کر جڑ گیا تھا اور اب اس کی شعلہ بار نگاہیں میرے چہرے پر مرکوز تھیں۔ میں بھی اپنی جگہ ہوشیار و محتاط تھا۔ میں نے طے کر لیا تھا کہ جنگ کی پہل اپنی طرف سے نہیں کروں گا۔

وہ عورت شعلہ بار نگاہوں سے مجھے گھورتی ہوئی کھڑی ہو گئی۔ ٹرین اپنی معمول کی رفتار سے چل رہی تھی اور منصور اور دھرم سنگھ کے خراٹے گونج رہے تھے۔ میں نے جیسے ہی مڑ کر ان دونوں پر نظر ڈالی کہ وہ عورت بولی۔ ''ادھر مت دیکھو۔ وہ بے خبر ہیں۔ ان کی نیند تبھی ٹوٹے گی جب میں انہیں جگاؤں گی۔''

میں سمجھ چکا تھا کہ اس نے مجھے پوری طرح گھیر لیا ہے۔اب میں اس سے کیسے نمٹوں؟ یہی سوچ رہا تھا کہ اس نے کہا۔ ''تم مرد ہوناں؟''

''تو کیا مجھے عورت سمجھ رہی ہو؟'' میں نے جواب دیا۔

''نہیں، میں تو تمہیں ''وہ'' سمجھ رہی ہوں۔'' اس کے چہرے پر مسکراہٹ کی شگفتگی پھیل گئی تھی۔اس نے ہاتھ نچا کر کہا۔''بات بس اتنی سی ہے کہ میں شکل وصورت میں بری نہیں ہوں اور کمپارٹمنٹ خالی ہے، پھر بھی تم دور دور رہے۔ سر اتارنے سے پہلے تو تمہیں میرے بارے میں کچھ علم نہیں تھا، اسی لیے کہتی ہوں کہ تم ''وہ'' ہو۔''

مرد سب برداشت کر لیتا ہے، لیکن ''حمیت'' پر حملہ برداشت نہیں کرتا۔ میں بھی تلملا کر کھڑا ہو گیا۔شاید میرے چہرے پر غصے کی جھلک آ گئی تھی۔اس عورت نے میرے غصے کو مزید ہوا دی۔''ارے واہ، تم تو ''مردانہ انداز'' میں لپک رہے ہو، کیا مجھے مارو گے؟''

''ہاں، ہاں، تمہارا گلا دبا دوں گا۔'' کہہ کر میں دونوں ہاتھ پھیلا کر اس کی طرف بڑھا۔

''آؤ، آؤ، یہ رہا میرا گلا۔'' اس عورت نے مزید اشتعال دلایا۔

میں دونوں ہاتھ بڑھا کر اس کی طرف بڑھا مگر یہ کیا؟ ہمارے درمیان صرف چند ہاتھ کی دوری تھی۔اس دوری کو طے کرنے کے لیے میں مسلسل دوڑ رہا تھا مگر ابھی تک میں اس تک پہنچ نہیں پایا تھا۔ایسا لگتا تھا کہ درمیان کا فاصلہ بہت زیادہ بڑھ گیا ہے۔وہ ہنوز اتنی ہی دور کھڑی اشارے سے مجھے للکار رہی تھی۔ میں دوڑتا چلا جا رہا تھا۔ دوڑتے دوڑتے میرے پیر تھک گئے تھے مگر فاصلہ طے ہو کر نہیں دے رہا تھا۔ جھلا کر میں نے چھلانگ لگائی۔ بس یہی میری بھول تھی۔ مجھے ایسا لگا جیسے میں ہوا میں اڑتا ہوا کسی خلاء میں گر گیا ہوں کیونکہ میرے چاروں طرف اندھیرا پھیل گیا تھا۔ میں نے ہاتھ پیر مارنے کی کوشش کی مگر کہیں کوئی ٹھوس چیز نہ ٹکرائی۔

ہر طرف گہرا اندھیرا تھا اور میں گرتا چلا جا رہا تھا۔کافی دیر تک میں ہاتھ پیر چلاتا رہا پھر مجھے ایسا لگا کہ اس گہرے کنویں کا سرا نزدیک آ گیا ہے۔ میں ایک جگہ ٹھہر گیا تھا۔ میرے پیر بھربھری مٹی سے ٹکرائے تھے اور میں نے خود کو ایک سرنگ نما جگہ پر پایا تھا۔ سر اٹھا کر اوپر دیکھا۔ دور، بہت دور آسمان پر جھلملاتے ستارے نظر آئے۔ سامنے دیکھا تو لمبی

سی راہ داری دکھائی دی۔

میں اس راہ داری میں بڑھتا چلا گیا۔وہ سرنگ نما راہ داری کافی لمبی تھی۔ میں آگے ہی آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔کافی آگے جانے کے بعد سرنگ کا دہانہ نظر آیا۔ میں نے رفتار بڑھا دی۔

باہر آیا تو حیرت کا شدید جھٹکا لگا، اس لیے کہ میں کسی گھنے جنگل میں کھڑا ہوا تھا۔ میری معلومات کے مطابق پورے بھاگل پور ضلع اور اس کے پڑوسی ضلع منگھیر میں کوئی جنگل نہیں ہے، پھر یاد آیا کہ منصور نے بتایا تھا۔ مندار ہل کے بعد سنتھال پرگنہ کا دُمکا ضلع شروع ہو جاتا ہے۔ یہ ضلع پہاڑوں سے گھرا ہوا ہے۔ میں سمجھ گیا کہ یہ دُمکا ضلع کا کوئی علاقہ ہے۔

میں اندازے سے آگے بڑھ رہا تھا کہ دور مجھے کالے کالے سے ہیولے نظر آئے۔ میں نے اندازہ لگا لیا کہ وہ جھونپڑیاں ہیں۔ میں ان جھونپڑیوں کی طرف بڑھنے لگا تھا تبھی نزدیک ہی کوئی کتا بھونکا۔ بس ایک کتے کا بھونکنا تھا کہ تمام کتوں نے آواز میں آواز ملانا شروع کر دی۔ کچھ ہی دیر میں میرے گرد کتوں کا ایک غول جمع ہو چکا تھا۔ میں نے انہیں خود سے دور رکھنے کے لیے اپنے ہاتھ میں ایک بڑی سی ٹہنی اٹھالی۔

کتے بھونک ضرور رہے تھے، مگر کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ میرے نزدیک آتا۔ میں ہُش ہُش کرتا آگے ہی آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔آبادی نزدیک آتی جا رہی تھی لیکن جیسے ہی میں نے آبادی میں قدم رکھا، ایسا لگا جیسے بھونچال آ گیا ہو۔ ہر گھر سے کرتال بجنے، سنکھ پھونکنے کی آواز بلند ہونے لگی۔

اتنی ساری آوازوں کو سن کر میں ٹھٹک گیا۔تبھی ایک جھونپڑی کا دروازہ کھلا اور پیلے کپڑوں میں ملبوس ایک شخص باہر آیا۔اس کے ماتھے پر سرخ رنگ کا قشقہ تھا۔اس نے اپنے ہاتھوں میں تلوار اٹھا رکھی تھی اور اس کے پیچھے دو نوعمر لڑکیاں تھیں جن کے ہاتھوں میں [illegible]ے کے پھولوں کا ہار تھا۔

[illegible]ب ایک ساتھ؟ میں چکرا گیا تھا، پھر خیال آیا کہ شاید یہ میری قربانی کرنا چاہتے ہیں۔ [illegible]ں کی قربانی ہوتی ہے، اس کے گلے میں بھی تو ہار وغیرہ ڈالتے ہیں۔

☆=====☆======☆

میں ابھی سوچ میں گم تھا کہ دھرم سنگھ نے کہا۔ ''او بھایا! گل کی اے' کن سوچاں وچ کھوئے ہو۔''

اس نرالی پنجابی نے مجھے خیالوں کی دنیا سے کھینچ لیا اور میں نے سامنے والوں پر سے نگاہیں ہٹالیں۔ اب میری توجہ ان سب کی جانب مبذول ہوگئی تھی جو بھجن کرتے ہوئے' مختلف ساز بجاتے ہوئے گھروں سے نکل رہے تھے۔ وہ سب جوش و جذبے سے سرشار تھے۔

سنکھ کرتال ڈھول تاشے کی آواز دم بہ دم بڑھتی جارہی تھی۔ پھر ایسا ہوا کہ یکا یک ہی تمام آوازیں بند ہوگئیں۔ ایسا لگا جیسے ہر طرف سکوت مرگ طاری ہوگیا ہو۔ سب کے سب سجدے میں جھک گئے تھے۔ تقریباً دس منٹ تک سب کی پیشانی مٹی پر رہی پھر یکا یک وہ سب ایسے اچھلے جیسے اسپرنگ کے بنے ہوئے ہوں پھر وہ سب اپنے اپنے منہ میں انگلیاں ڈال کر زور زور سے آوازیں نکالنے لگے۔

دس گیارہ سال کی عمر میں ابو کے ساتھ مشرقی پاکستان گیا تھا۔ وہاں دیکھا تھا کہ ہندو عورتیں شام ہوتے ہی اسی طرح کی آوازیں نکالتی ہیں۔ پندرہ منٹ کے اس عمل کو وہ اُلو کہتی ہیں۔ شاید یہ بھی اسی قسم کا عمل تھا۔ میں حیرت سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا کہ ان میں سے ایک شخص اپنی جگہ سے اٹھا اور میرے قریب آکر بولا۔ ''اے دور دیس سے آنے والے۔ میں اس قبیلے کا سردار ہوں۔ ہمارے پروہت جی نے اپنے علم و عقل سے تجھے آتے دیکھ لیا تھا۔ اس نے کہا تھا جیسے ہی وہ نوجوان آئے اسے عزت و احترام دیا جائے۔''

اب لوگ آہستہ آہستہ میرے گرد جمع ہوتے جارہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں میرے لیے تحسین تھا احترام تھا۔ عقیدت تھی۔

''چلو ہم پروہت جی کی کٹیا میں چلتے ہیں۔'' سردار نے کہا تو میں اس کے ساتھ چل پڑا۔

باقی لوگ احترام کے ساتھ ہاتھ باندھے میرے پیچھے پیچھے چلے آرہے تھے۔ سب کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ ساتھ ہی ساتھ وہ سب کچھ گنگناتے بھی جارہے تھے۔ شاید کوئی اشلوک پڑھ رہے تھے۔

بالآخر ہم ایک بڑے ..... نپڑے تک پہنچ گئے۔ سردار ہمیں ساتھ لے کر اندر داخل

ہوا۔ وہ اندر سے بھی کشادہ تھا۔ بالکل ہال جیسا' اندر پہنچ کر میں نے غور سے دیکھا کونے میں ایک منحنی سا بوڑھا بیٹھا ہوا تھا اس کے لمبے لمبے بال اور ناف تک پہنچی ہوئی داڑھی بالکل روئی کے گالوں کی طرح سفید تھی۔ اس کے پاس بٹھا کر سردار الٹے پیروں چلتا ہوا جھونپڑے سے باہر نکل گیا۔

بوڑھا آنکھیں بند کیے مراقبے کے عالم میں بیٹھا ہوا تھا۔ میں اسے مخاطب کرنے کی سوچ ہی رہا تھا کہ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ اس کی آنکھوں میں غضب کی چمک تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے دو آنکھوں کی جگہ سرچ لائٹ نصب ہوں۔ اس نے میرا جائزہ لے کر کہا۔ ''تو وہ تم ہو جو ہماری مکتی کے لیے آئے ہو؟''

''مکتی کے لیے؟ میں سمجھا نہیں' آپ تو آزاد ہیں پھر آزادی کا مطلب کیا؟''

''ہم کمکھیا دیوی کے ماننے والے ہیں' کمکھیا دیوی یعنی جادو کی دیوی۔ ہماری دیوی ہماری محافظ ہے۔ مگر اسے یہ بھی منظور نہیں کہ کوئی اور جادو سیکھے۔ پھر بھی کبھی کبھی کوئی نہ کوئی سر پھرا ایسا پیدا ہو ہی جاتا ہے جو جادو میں اس سے آگے نکلنے کی کوشش شروع کر دیتا ہے اور تب وہ شراپ گرستہ (بد عا رسیدہ) ہو جاتا ہے۔''

''تم پروہت ہو صرف پوجا تو کراتے نہیں ہوگے خود بھی منتر تنتر کرتے ہوگے۔''

''جی ہاں! میں تنتر منتر کرتا ہوں مگر اپکار ہیتو (فائدے کے لیے) ہانی ہیتو (نقصان کے لیے) نہیں اور وہ بھی پہلے دیوی کی پوجا کرتا ہوں پھر کچھ اور مگر اب ایک ویکتی (ایک شخص) نے جادو منتر میں کمال حاصل کرلیا ہے۔ اسی کے ویناش (خاتمہ) کے لیے تمہیں بلایا ہے۔ میں نے زائچہ بنا کر دیکھ لیا تھا کہ تم آنے والے ہو اور تمہیں خود اس ویکتی نے نادانستگی میں بھٹکایا اور تم بھٹک کر ادھر آگئے۔ اس لیے کہ ستارے یہی چاہتے تھے کہ تم آؤ۔ ہمیں مکتی دلاؤ۔''

''مگر میں تو خود راہ بھٹک کر آیا ہوں' مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ یہاں سے باہر نکلنے کا راستہ کدھر ہے ان حالات میں' میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں۔''

''بتایا ناں کہ تم راستہ بھٹک کر نہیں آئے ہو بلکہ ستارے تمہیں کھینچ کر لائے ہیں۔ انسان کے ہر عمل کا دارومدار ستاروں پر ہوتا ہے۔ وہ جو چاہتے ہیں وہی ہوتا ہے۔ میری کمکھیا دیوی نے بھی یہی کہا ہے۔ ان باتوں پر دھیان نہ دو۔ آرام کرو۔ میں ہی پروہت

ہوں۔کوئی ضرورت ہوتو بتا سکتے ہو۔"

''میں تم سے مزید معلومات چاہتا ہوں سردار۔''

''پوچھو!''

''تمہارے قبیلے کا نام کیا ہے؟''

''ہم سب کمکھیا دیوی کے پجاری کہلاتے ہیں۔اس کا جادو عظیم ہے۔''

''تو پھر تم کمکھیا سے مدد طلب کیوں نہیں کرتے کہ وہ تمہارے دشمن کا نام و نشان مٹا دے۔''

''دیوی اپنے پجاری کو نقصان نہیں پہنچاتی۔ بدنصیب خود موت کے پاس پہنچ جاتا ہے۔جیسے وہ بدنصیب شخص جسے لوگ شیام کہتے ہیں۔اس نے ماتا کو قبضے میں کرنا چاہا ہے اوراس کی تباہی کے لیے ماں نے تمہیں بلالیا۔''

''شیام نے کمکھیا کو غلام بنانا چاہا ہے'اسی لیے تم لوگ اس کے دشمن بن گئے؟''

''نہیں وہ ہمیں بھی ستا رہا ہے تاکہ ماتا کمکھیا کو دکھ دے سکے۔''

''تم سب مل کر مقابلہ کیوں نہیں کرتے ہو؟''

''ہم بھی مجبور ہیں۔کمکھیا کے پجاریوں پر بلی (قربانی) دینا منع ہے۔''

''وہ تم لوگوں کو کس کس طرح ستاتا ہے؟''

''قبیلے کی ہر عورت اس کی بیوی ہے وہ جب اور جسے چاہتا ہے بلا لیتا ہے۔ہم سب غلام بن کر زندگی گزار رہے ہیں۔''

''تم لوگ عبادت کب کرتے ہو؟''

''صبح کے وقت ہم نکلتے سورج کی پوجا کرتے ہیں۔''

''کیا شیام بھی پوجا کے لیے آتا ہے؟''

''شیام تانترک ہے پنڈت نہیں اور تانترک بھی ایسا کہ صرف کالا علم کرتا ہو یعنی پورے کا پورا شیطان ہے اور شیطان کو پوجا سے کیا کام وہ تو ہر رسم سے بے نیاز ہوتا ہے۔''

''شکریہ! میں تمہارے اس تعاون کے لیے بے حد شکر گزار ہوں۔ میں بھی کل صبح کی عبادت میں شریک ہوں گا صرف دیکھنے کے لیے۔'' پھر میں اس کے پاس سے اٹھ گیا۔ دھرم سنگھ بھی میرے ساتھ ساتھ تھا۔ ہم اٹھ کر سیدھے اس جھونپڑے میں آئے جہاں مجھے

ٹھہرایا گیا تھا۔جسم تھکن سے ٹوٹ رہا تھا۔فرش پر پتوں اور دھان کے پیال سے بنا بستر بچھا ہوا تھا۔ہم دونوں لیٹتے ہی بے خبر ہو گئے۔

☆======☆======☆

صبح میری آنکھ کھلی تو میں پھرتی سے اٹھ بیٹھا کیوں کہ پو پھٹنے والی تھی۔ دھرم سنگھ بے خبر سو رہا تھا میں نے اسے اٹھانا مناسب نہیں سمجھا اور اکیلے ہی نکل پڑا۔ باہر آیا تو ایک شخص گاؤں سے باہر جاتا نظر آیا۔ میں نے اس کے نزدیک پہنچ کر پوچھا۔''صبح کی پوجا کہاں ہوتی ہے۔''

''میں وہیں جا رہا ہوں؟''

''میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔''

''تم؟'' وہ حیرت انگیز دلچسپی سے بولا۔

''ہاں' تمہیں حیرت کیوں ہے؟''

''اس لیے کہ تم ہم میں سے نہیں ہو تمہارا عبادت کرنا ہمارے لیے حیرت انگیز ہوگا۔''

''بہرحال مجھے اپنی عبادت گاہ لے چلو۔''

''آؤ' میرے ساتھ آجاؤ۔'' اس نے کہا اور میں اس کے ساتھ چل پڑا۔اس کا رخ جھونپڑوں کے عقبی میدان کی جانب تھا۔ میں اس میدان کے دوسری سمت سے یہاں آیا تھا اس لیے یہ عقبی حصہ ابھی تک میری نگاہ سے پوشیدہ تھا۔

نیم تاریکی میں یہ ماحول بے حد دل کش اور پُراسرار لگ رہا تھا۔عقب میں ایک وسیع و عریض میدان پھیلا ہوا تھا جس کے اختتام پر سیاہ پہاڑیوں کا سلسلہ تاحدِ نگاہ تھا۔ یہ پہاڑیاں اس طرف کے ماحول کی ضد تھیں' حسین مرغزاروں میں ان کی بدنمائی عجیب سی لگ رہی تھی۔ میں نے دلچسپی سے یہ منظر دیکھا' ان کے درمیان آگ جل رہی تھی' میرا رہبر ایک جگہ کھڑا ہو گیا اور میں نے ٹھٹک کر اسے دیکھا۔

''یہی عبادت کا میدان ہے۔ درمیان میں سلگتی ہوئی آگ سورج کے عکس کا پرتو ہے۔ یہ آگ سورج کی آگ کی نشاندہی کرتی ہے اور ہم اس کی عبادت کریں گے۔'' میرے رہبر نے مجھ سے کہا۔

''لیکن میرے دوست ابھی تو یہاں زیادہ لوگ نہیں آئے ہیں' کیا پوری بستی کے

لوگ عبادت نہیں کرتے۔'' میں نے سوال کیا۔

''مجال ہے کسی کی' ہر شخص صبح کو سورج کی آمد کا انتظار اس میدان میں کرتا ہے چند ساعت دیکھتے جاؤ ابھی وقت نہیں آیا۔'' اس نے کہا اور میں نے خاموشی سے گردن ہلا دی۔ یہ ساری چیزیں میرے لیے بے حد دل کش تھیں۔

میں ابھی سوچ میں گم تھا کہ آگ میں سفید دھوئیں کے بادل نمودار ہوتے دیکھے۔ ایک عجیب سی انوکھی سی خوشبو چاروں طرف پھیل گئی تھی۔ غالباً آگ کے الاؤ میں کوئی خوشبودار چیز ڈال دی گئی تھی اور اس کے ساتھ ہی اچانک چاروں طرف سے آوازیں ابھرنے لگیں اور تیزی کے ساتھ میدان لوگوں سے بھرنے لگا۔ پہلی صف دوسری صف اور تیزی سے صفیں بھرنے لگیں۔ صفوں کے درمیان بے ہنگم انداز میں نوجوان رقص کرتے پھر رہے تھے۔

تب مجھے ایک آواز سنائی دی اور یہ آواز پروہت کی تھی۔ پروہت چیخ رہا تھا۔ ''باہر سے آنے والے اجنبی! تم جہاں بھی ہو میرے پاس آ جاؤ میں اس تیز الاؤ کے نزدیک موجود ہوں۔'' اور یہ آواز میرے لیے تھی۔ چنانچہ میں لوگوں کے ہجوم کو چیرتا آگے بڑھنے لگا۔ میرا ساتھی ایک لمحے کے لیے حیران رہ گیا تھا۔

چند ساعت کے بعد میں پروہت کے نزدیک پہنچ گیا۔ وہ الاؤ کے نزدیک ہی موجود تھا اور اسے تلاش کرنے میں مجھے کوئی دقت نہ ہوئی تھی کیوں کہ شعاعوں کی روشنی اس کا چہرہ نمایاں کر رہی تھی۔ اس کے نزدیک ہی چار آدمی بھی موجود تھے جو خاصے عمر رسیدہ تھے اور جن کے بال جٹاؤں کی شکل میں نیچے تک پھیلے ہوئے تھے۔ بدن ان کے بھی ننگ دھڑنگ تھے اور ان کے بدن پر عجیب و غریب قسم کے نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔ ایسے نقش و نگار جو میں اس سے پہلے بھی لوگوں کو آرائش بدن کے لیے بناتے ہوئے دیکھ چکا تھا۔

پروہت نے مجھے اپنے قریب بالکل قریب بلا لیا اور تب میں نے پہلی بار اس عجیب و غریب مجسمے کو دیکھا جو خاصا طویل و عریض تھا۔ سیاہ رنگ کے پتھر سے تراشی ہوئی دیوی عجیب و غریب خدوخال کی مالک تھی۔ انتہائی بھونڈے سے خدوخال تھے اور باقی بدن کو نسوانی روپ دینے کی ناکام کوشش کی گئی تھی بہرصورت یہ دیوی کمکھیا تھی۔ میں پروہت کے نزدیک کھڑا ہو گیا۔

عبادت شروع ہو گئی آہستہ آہستہ سورج بلند ہو رہا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ ہی ان لوگوں کے جوش و خروش میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اتنا شور مچا رہے تھے' اتنا چیخ رہے تھے یہ لوگ کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔

مرد عورتیں بوڑھے بچے سب ہی موجود تھے اور سب کے سب دیوانہ وار چیخ رہے تھے۔ ویسے یہ ایک انوکھی عبادت تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ یقینی طور پر جھونپڑے میں دھرم سنگھ جاگ اٹھا ہو گا۔ اس تصور کے ساتھ میں تھوڑا سا پریشان بھی ہو گیا تھا۔ بہرصورت لوگوں کے ہجوم سے نکلنا آسان بات نہیں تھی۔ یوں بھی میں نے پروہت کو مطمئن کرنے کا وعدہ کیا ہوا تھا۔ چنانچہ میں خاموشی سے ان کی عبادت دیکھتا رہا۔

پھر جونہی سورج کی پہلی کرن نمودار ہوئی۔ وہ سب اچانک خاموش ہو گئے۔ اتنی تیز چیخوں کے بعد یہ خاموشی بڑی عجیب اور انوکھی لگ رہی تھی۔ میں دم سادھے ان لوگوں کی حرکات و سکنات دیکھ رہا تھا' چند سیکنڈ وہ لوگ خاموش رہے اور سورج بلند ہوتا رہا پھر جب سورج نے سر ابھارا تو وہ لوگ مطمئن ہو گئے۔ گویا اب عبادت ختم ہو گئی تھی۔ تب پروہت مسکراتے ہوئے بولا۔

''میرے دوست نہ جانے کیوں تمہاری بات پر مجھے یقین ہے حالانکہ ہمارے مذہب میں یہ بات نہیں ہے کہ ہم کسی ایسے شخص پر بھروسا کریں جو ہمارا ہم مذہب نہ ہو اور مسافر یا اجنبی ہو یا پھر اس نے دیوی کمکھیا کے سامنے اپنی سچائی کا ثبوت نہ پیش کر دیا ہو مگر تم تو وہ ہو جس کا اشارہ ستارے دے رہے ہیں اس لیے سامنے آؤ۔''

وہ بولا تو میں دیوی کے بت کے سامنے پہنچ گیا۔ تب اس نے ایک بوڑھے کو اشارہ کیا اور وہ بوڑھا ہمارے نزدیک پہنچ گیا۔ وہ بوڑھے سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''اسے پہچان لو یہی ہمارا مکتی داتا ہے۔ شیام کا وناش کرے گا۔''

پوجا ختم کر کے پروہت چلا گیا اور میں جھونپڑے میں داخل ہو گیا۔ میرا خیال تھا کہ دھرم سنگھ ضرور جاگ گیا ہو گا۔ آوازوں سے فکرمند بھی ہوا ہو گا اور میرا خیال درست نکلا۔ وہ اس جگہ نہیں تھا جہاں میں اسے چھوڑ کر گیا تھا۔ میں نے چاروں طرف دیکھا لیکن وہ جھونپڑی میں نہیں تھا۔

بے چارہ پریشانی کے عالم میں مجھے تلاش کرنے نکل گیا ہو گا۔ میں تیزی سے باہر نکل

آیا اور پھر میں جھونپڑے کے اطراف میں ان ساری جگہوں تک جہاں دھرم سنگھ کے جانے کا امکان ہوسکتا تھا' تلاش کرتا پھرا لیکن وہ موجود نہ تھا۔ کیا وہ کافی دور نکل گیا۔ ممکن ہے اس میدان کی طرف لیکن میدان اب سنسان پڑا تھا' سوائے آگ کے جو اب بھی تیزی سے جل رہی تھی۔ تب میں نے زور سے اسے پکارا لیکن کوئی جواب نہ ملا' میں کسی قدر پریشان ہوگیا تھا۔

وہاں سے واپس آ کر میں نے ایک شخص کو پکڑا اور اس سے کہا۔ ''میرے ساتھ ایک سکھ تھا' کیا تم نے اسے دیکھا ہے؟''

اس نے حیرانی سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''وہ کھو گیا؟ کیا وہ اس جگہ نہیں ہے' جہاں تمہارا قیام ہے؟''

''نہیں' وہ وہاں موجود نہیں ہے۔''

''کس وقت چھوڑا تھا تم نے اسے وہاں؟''

''اس وقت جب ہم سب عبادت کے لیے گئے تھے۔'' میں نے جواب دیا اور وہ تعجب سے گردن ہلانے لگا:

''اس وقت تو بستی میں کسی فرد کا وجود بھی نہیں ہوتا' پوری بستی خالی ہو جاتی ہے' تمہیں اسے یہاں چھوڑ کر نہیں جانا چاہیے تھا۔''

میں نے اس کی نصیحتیں سننے کی بجائے آگے بڑھ کر دھرم کو تلاش کرنا مناسب سمجھا اور پھر ہم کافی دیر تک اس کی تلاش میں بستی کے کونے کونے میں مارا مارا پھرتا رہا۔ میں نے بے شمار لوگوں سے اس کے بارے میں معلومات کیں اور دھرم سنگھ کو نہ پا کر میں سردار کی قیام گاہ کی طرف چل پڑا۔

قیام گاہ کے باہر پہرے دار موجود تھے۔ انہوں نے سَردار کو میری آمد کی اطلاع دی تو وہ اپنے جھونپڑے سے باہر نکل آیا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ تب اس نے سادگی سے پوچھا۔ ''کیا میں کسی خاص کام سے اس کے پاس آیا ہوں۔''

''ہاں میری جھونپڑی سے میرا ساتھی غائب ہے جو میرے ساتھ تھا۔''

''کیا مطلب؟'' سردار کئی قدم آگے بڑھ آیا۔

''وہ میرے جھونپڑے میں موجود نہیں ہے۔''

''کہاں گیا اور کب؟''

''اس وقت جب میں عبادت کے لیے گیا تھا' تو وہ جھونپڑے ہی میں سو رہا تھا لیکن جب ہم وہاں سے واپس آئے تو وہ اپنی جگہ موجود نہیں تھا۔ اس کے بعد میں نے بستی کے اطراف میں' میدان میں' ہر جگہ کونے کونے میں اسے تلاش کیا ہے لیکن وہ نہیں ملا۔''

''کیا؟'' سردار نے کہا۔

''ہاں سردار! وہ موجود نہیں ہے' براہ کرم سردار اس کی تلاش میں میری مدد کرو۔''

''یقیناً یقیناً۔ یہ تمہارے کہنے کی بات نہیں ہے۔'' اس نے جواب دیا اور پھر وہ تیزی سے آگے بڑھ گیا۔

سردار نے چند افراد کو جمع کیا اور انہیں مختلف ہدایات دیں۔ اس نے ان سے کہا کہ بستی کا ہر فرد سردار جی کو تلاش کرے بلکہ ہر جھونپڑے میں ہر جگہ اس بستی کے اطراف میں دور دور تک نکل جائے اور سردار جی کو تلاش کرے' سردار جی ہر حال میں چند گھنٹوں کے اندر اندر مل جانا چاہئیں۔

لوگوں نے سردار کی ہدایت سنیں اور چاروں طرف دوڑ گئے۔ میرے انداز میں کچھ پریشانی پیدا ہوگئی تھی۔ میرے ذہن میں یہ بھی تھا کہ دھرم کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آ گیا ہو یا وہ خوف زدہ ہو کر کہیں چھپ گیا ہو' بہرصورت یہ لوگ اسے تلاش کرنے کے لیے گئے تھے تو کامیاب ہی لوٹیں گے۔

سردار نے مجھے اپنے ساتھ ہی رہنے کے لیے کہا اور پھر اس نے مجھے اپنے جھونپڑے میں بیٹھنے کی دعوت دی۔ ہم دونوں اندر چلے آئے۔ اندر آ کر ہم دونوں اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے۔

شاید میرے چہرے پر پریشانی جھلک آئی جسے دیکھ کر سردار بولا۔ ''پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے دوست' ظاہر ہے وہ زیادہ دور نہیں جائے گا۔ اب اتنا ناسمجھ بھی نہیں ہے کہ جنگلوں میں بہت دور تک نکل جائے۔ میرے تیز دوڑنے والے نوجوان اسے تلاش کرلیں گے' تم اس سلسلے میں بے فکر ہو جاؤ۔''

سردار نے کہا تو میں نے گردن ہلا دی اور کہا۔ ''اسے ہر قیمت پر ملنا چاہیے سردار! اسے ہر قیمت ملنا چاہیے' تم یقین کرو اس کی وجہ سے میری زندگی کا رخ بدلا ہوا ہے' ورنہ میں

نہ جانے کہاں ہوتا؟''

''یقیناً یقیناً وہ ہمارا مہمان ہے اور تم بھی میری پناہ میں ہو' اس لیے تم بے فکر ہو جاؤ' اسے تلاش کر کے تمہارے حوالے کرنا ہماری ذمے داری ہے۔'' سردار نے بڑے اعتماد سے کہا۔

میں کافی دیر تک اس کے ساتھ بیٹھا رہا' سردار تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد کوئی نہ کوئی گفتگو چھیڑ دیتا تھا۔ شاید وہ میری ذہنی رو کا رخ موڑنا چاہتا تھا۔

دفعتاً کسی خیال کے تحت وہ چونک کر متوحش لہجے میں بولا۔ ''کیا اس کا پورا لباس اس کے بدن پر تھا' کوئی ایسی چیز تو جھونپڑے میں نہیں رہ گئی جس سے اندازہ ہو کہ اسے اس کی مرضی کے خلاف کسی نے جھونپڑے سے اٹھایا ہے۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔

''میرے ساتھ چلو' میرے ساتھ آؤ۔'' سردار اٹھ گیا نہ جانے اس کے ذہن میں کیا خیال تھا۔ بہرصورت وہ میرے ساتھ میرے جھونپڑے کی جانب چل پڑا۔ تب اس نے جھونپڑے کے اندر داخل ہو کر دیکھا اور ایک لمحے کے لیے ساکت رہ گیا۔

''آہ...... آہ یہ کیا ہوا؟'' اس نے عجیب سے انداز میں کہا اور میں پریشانی سے اسے دیکھنے لگا۔

''کیا ہوا سردار؟ کیا کوئی خاص بات تمہارے ذہن میں آئی ہے؟''

''بو...... ایک مکروہ اور شیطانی بو۔ میں اس کو اس جھونپڑے میں ہی محسوس کر رہا ہوں اور یہ اس منحوس انسان کے بدن کی بو ہے جو ہماری پیشانی کا داغ ہے۔''

''سردار براہ کرم مجھے صاف الفاظ میں بتاؤ۔ تم کہنا کیا چاہتے ہو؟''

''شیام...... وہ جہاں جاتا ہے اس کے بدن کی بو وہاں رہ جاتی ہے اور دیر تک یہ بو فضا میں پھیلی رہتی ہے۔ بڑا ہی ناپاک انسان ہے وہ۔''

''تو تمہارا مطلب ہے وہ اس جھونپڑے میں آیا تھا؟'' میں نے خونخوار لہجے میں پوچھا۔

''میرے دوست میرا تجربہ غلط نہیں ہے' لیکن ٹھہرو میں ایک شخص کو بلاتا ہوں۔ وہ اس کی صحیح نشاندہی کر سکے گا۔'' سردار نے کہا اور باہر نکل آیا۔ پھر اس نے کسی کو بلانے کے

لیے کہا اور چند ساعت کے بعد وہی بوڑھا جسے سنکارا کہہ کر مخاطب کیا گیا تھا جھونپڑے میں موجود تھا۔ بوڑھے نے جھونپڑے میں قدم رکھا اور ٹھٹک گیا۔

''شیام کی بو محسوس ہو رہی ہے۔'' اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا اور سردار نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ لیا۔

میں خاموشی سے ان دونوں کی شکل دیکھ رہا تھا۔ پھر میں نے آگے بڑھ کر کہا۔ ''تم دونوں کا کیا خیال ہے' براہ کرم مجھے بھی تو بتاؤ۔''

''یہ قطعی اتفاق ہے کہ میں نے تمہیں شیطان صفت شیام کے بارے میں بتایا تھا۔ میرا خیال ہے کہ اس سکھ کو شیام لے گیا ہے۔''

''لیکن کیوں؟'' میں نے گرجدار آواز میں پوچھا۔

''کیا کہا جا سکتا ہے اس شیطان کے بارے میں لیکن اس منحوس نے بہت بری حرکت کی ہے۔ سنکارا بتاؤ۔ اب کیا کیا جائے؟''

''ہم سب اس کے سامنے بے بس ہیں۔ کوئی کیا کر سکتا ہے۔'' بوڑھے نے لاچاری کا مظاہرہ کیا۔

''وہ کہاں ملے گا سردار؟'' میں نے پُرجوش لہجے میں کہا۔

''شیام کے بارے میں پوچھ رہے ہو؟'' سردار نے تھکے انداز میں پوچھا۔

''ہاں!'' میں نے سر ہلا کر جواب دیا۔

''اس منحوس کا ٹھکانا ان ہی سیاہ پہاڑیوں میں ہے جنہیں تم نے عبادت گاہ کے آخری سرے پر دیکھا ہو گا یا پھر وہ منگھیر ضلع کے تاراپور میں واقع ایک ویران حویلی میں پایا جاتا ہے۔ لیکن اس کو تلاش کرنا ناممکن ہے۔''

''سردار اس ناممکن کو ممکن بنانا ہو گا' ویسے بھی یہ اصول مہمان نوازی کے خلاف ہے۔'' میں نے غصیلے لہجے میں کہا۔

''یقین کرو میرے دوست' میں شرمندہ ہوں۔ ہم نے یہاں شیام کی بو محسوس کی ہے۔ اس لیے ہمارا خیال اس طرف گیا ہے لیکن شیام کی قوت تمہارے مقابلے میں کم ہے۔ یہ ہمارا نہیں ستاروں کا کہنا ہے۔ اسے تم ہی شکست دے سکتے ہو اگر اس موذی سے ہمیں بھی نجات دلا سکتے ہو تو ہم تمہیں نجات دہندہ کہیں گے۔''

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں دھرم سنگھ کو ایسے مصائب سے بچا کر لایا تھا جن میں موت یقینی تھی۔ یہاں آ کر میں اسے کھونا نہیں چاہتا تھا اور اگر دھرم سنگھ نہ ملا تو پھر میں نہیں کہہ سکتا کہ ان لوگوں کے ساتھ میرا کیا رویہ ہو۔

سردار سچا انسان تھا' اس کی نیت میں کوئی کھوٹ نہیں تھا۔ بہر حال میں دھرم سنگھ کے لیے سخت پریشان تھا۔ پھر میں نے سردار سے کہا:

''مجھے ہتھیار چاہیے سردار۔''

''ہاں ضرور' آؤ میرے ساتھ آؤ۔'' سردار مجھے اپنے جھونپڑے میں لے گیا اور پھر اس نے مجھے ہتھیاروں کے ذخیرے کے سامنے کھڑا کر دیا اور بولا۔ ''اس میں سے جو پسند آئے لے لو۔''

میں نے اپنی پسند کا ہتھیار لے لیا اور باہر نکل آیا۔ دوپہر کے بعد میں نے سیاہ پہاڑیوں کا رخ کیا۔ ایسا عجیب وغریب پہاڑی سلسلہ میں نے اس سے قبل نہیں دیکھا تھا۔ پوری پوری چٹانیں اس قدر چکنی اور سپاٹ تھیں کہ قدم جمانا مشکل تھا میں اس غار کی تلاش میں بھٹکتا پھرا' لیکن سورج ڈھل گیا اور مجھے کوئی غار نظر نہیں آیا۔

میرے دل میں انتہائی غصہ تھا۔ اگر شیام مجھے مل جاتا تو میں اس کا خون پی جاتا۔ میں نے سوچا اور اچانک ہی سردار کے کچھ الفاظ میرے ذہن میں گونج اٹھے۔ میں خاموشی سے واپس چل پڑا تھا۔

سردار بے چارہ اپنے طور پر کوشش میں مصروف تھا۔ اس نے میری صورت دیکھی اور ایک ٹھنڈی سانس لے کر گردن جھکالی۔ پھر بولا۔ ''تم اس غار کو تلاش کرنے میں ناکام رہے ہو گے۔''

''ہاں لیکن میں ناکامی نہیں چاہتا سردار۔''

''میرے دوست میں تمہارے لیے کیا کروں؟''

''تم نے کہا تھا سردار کہ وہ قبیلے کی کسی لڑکی کو منتخب کرتا ہے۔''

''ہاں!'' سردار چونک پڑا۔

''اس کا کیا طریقہ ہوتا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''بس ڈوبتے چاند کی رات کو ایک نوجوان لڑکی کو خوشبوؤں میں بسا کر سیاہ پہاڑیوں

میں ایک مخصوص مقام پر بھیج دیا جاتا ہے اور اس کے بعد اس کی خون نچڑی ہوئی لاش وہاں سے اٹھالی جاتی ہے۔''

''کتنے دن باقی ہیں اس رات میں؟''

''صرف چند روز' لیکن کیوں؟''

''اس بار تم مجھے بھیجو گے لڑکی کے بھیس میں سردار۔'' میں نے کہا اور سردار کسی سوچ میں گم ہو گیا۔ اس کے چہرے پر حزن وملال کے آثار نظر آ رہے تھے۔

☆======☆======☆

چاند کی آخری رات تھی اور اس رات کے آخری پہر اس نوجوان لڑکی کو سیاہ پہاڑیوں میں بھیجا جانے والا تھا جو اس بار شیام کا نشانہ بننے کے لیے تیار تھی۔

ان چند دنوں میں دھرم سنگھ کا کوئی پتا نہیں چل سکا تھا اور میرا دل اس کے لیے خون کے آنسو روتا تھا۔

سردار خاصا مایوس تھا بہرصورت وہ میری راہ میں آنا بھی نہیں چاہتا تھا چنانچہ تاریک رات کے آخری پہر میں اس نے مجھے الوداع کہا اور میں سیاہ پہاڑوں کی طرف چل پڑا۔ سردار نے مجھے بتا دیا تھا کہ مجھے وہاں جا کر کیا کرنا ہے۔ میرا ذہن عجیب سے خیالات میں ڈوبا ہوا تھا۔ ان خیالات میں خوف کا عنصر تو نہیں تھا البتہ ایک الجھن ضرور تھی میں سوچ رہا تھا کہ ان شیطانی قوتوں کا کوئی علاج میرے پاس نہیں ہے؟ تب میں نے رک کے اپنے سچے جذبوں کو آواز دی۔ میں نے سوچا کہ میں نے سچائی کی راہ میں قدم رکھا ہے۔ مجھے آسمانوں سے امداد درکار ہے اور میں نے ایک روشنی کوندتے دیکھی۔

پہلے وہ ایک ننھا سا ستارہ لگا تھا مگر جیسے جیسے وہ نزدیک آتا جا رہا تھا۔ خدوخال واضح ہوتے جا رہے تھے۔ وہ ایک نوجوان تھا جو ایک اڑتے ہوئے رتھ پر سوار تھا۔ جب وہ بالکل نزدیک آ گیا تو میں نے اسے پہچان لیا۔ یہ وہی تھا جس نے خود کو بطور جن زادہ متعارف کرایا تھا۔ اس وقت تک میں اسے صرف ایک عالم سمجھ رہا تھا۔ ایسا عالم جس کے پاس قرآن کا علم بہت زیادہ ہے مگر آج جب کھلی آنکھوں سے اسے دیکھا تو اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔

انسان کی تخلیق مٹی سے ہوئی ہے اور مٹی وزن رکھتی ہے اور وزن کو زمین کی کشش کھینچے رکھتی ہے اس لیے وہ ہوا میں اڑ نہیں سکتا جبکہ یہ نوجوان ہوا میں اڑتا ہوا آیا تھا۔ آگ ہلکی ہوتی

ہے اس لیے وہ بہ آسانی ہوا میں بلند سے بلند ہوتی چلی جاتی ہے۔ جنات کی تخلیق آگ سے ہوئی ہے اسی لیے وہ بہ آسانی ہوا میں اڑ سکتے ہیں۔

اتنی دیر میں وہ میرے نزدیک آ کر اتر گیا۔ پہلے سلام کیا پھر بولا۔ ''مبارک ہو شیام نامی شیطان کی موت کا وقت قریب آ چکا ہے۔ بس اسے بہانہ چاہیے۔''

''میں کیا کروں؟'' میں نے پوچھا۔

''یاد رکھو ہر انسان کو دو بار زندگی ملتی ہے' ایک بار مختصر عرصے کے لیے اور دوسری بار طویل عرصے کے لیے مختصر عرصے والی زندگی وہ ہے جو تم اس دنیا میں گزارتے ہو۔ یہ دنیا نقلی ہے اصل دنیا اور ہے۔''

میں تو پہلے ہی پریشان تھا اس لیے چڑ کر بولا۔ ''کیا آپ وعظ سنانے کے لیے آئے ہیں؟''

''نہیں میں کچھ اور بتانا چاہتا ہوں۔ سوچو ہمارے لیے پانچ وقت کی نمازیں کیوں فرض ہوئی ہیں؟ حبیب خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے قبل جتنے نبی معبوث ہوئے ان کی امت پر عبادت کے لیے اتنی سختی کیوں نہیں تھی؟ وہ مذہب بھی سچے تھے۔ حضرت نوحؑ' حضرت ہودؑ' حضرت صالحؑ' حضرت ابراہیمؑ' حضرت لوطؑ' حضرت اسحاقؑ' حضرت اسمٰعیلؑ' حضرت یعقوبؑ' حضرت یوسفؑ' حضرت شعیبؑ' حضرت موسیٰ و ہارون! حضرت داؤدؑ' حضرت سلیمان!' حضرت ایوبؑ' حضرت یونسؑ' حضرت عزیزؑ' حضرت زکریاؑ' حضرت یحییٰؑ' وغیرہ کی امت میں سے کسی کو رکوع کا حکم تھا تو کسی کو صرف قیام کا تو کسی کو صرف سجدے کا۔ ایسا صرف اس لیے تھا کہ اس دور میں زمین کی گردش کچھ اور تھی اور اب رفتار روز او یہ بدل چکا ہے۔ ابھی کچھ ہی دنوں قبل جاپان کے سولہ رکنی سائنس دانوں کی ٹیم نے تین سالہ تحقیق کے بعد جو رپورٹ دی ہے وہ بھی چونکانے والی ہے۔ رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ زمین کی مقناطیسی کشش چالیس فیصد کم ہوگئی ہے کیونکہ زمین سے مقناطیسی لہریں کنکریلے ولوہے کی دیواروں سے ٹکرا کر فنا ہو رہی ہیں۔ مقناطیسی کشش کا خاتمہ' آلودگی میں اضافہ اوزون کے سوراخ کو وسیع کر رہا ہے۔ نتیجتاً الٹرا وائیلٹ شعاعیں زیادہ آ رہی ہیں اور انسانی قوتِ مدافعت کم ہوتی جا رہی ہے۔ اسی لیے عبادت کی سختی سے پابندی کا حکم ہے تاکہ مخصوص وقت میں گلیکسی سے آنے والی قوت بخش شعاعیں انسانی جسم کے مخصوص حصے پر پہنچ جائیں۔ یہی

شعاعیں انسان کے اندر پُراسرار قسم کی یعنی سمجھ نہ آنے والی قوتیں پیدا کر دیتی ہیں۔ ابھی کچھ دیر بعد تہجد کا وقت ہو جائے گا۔ یہ وقت بہت اہم ہے۔ یہ ڈنڈا لو ایسے ہی وقت میں یہ ڈنڈا تمہارے بہت کام آئے گا۔'' کہہ کر اس نے ڈنڈا تھمایا پھر بولا۔ ''حضرت جی کا یہی حکم ہے کہ تم اس ڈنڈے کو استعمال کرو۔ شیام لاتوں کا بھوت ہے' باتوں سے نہیں مانے گا۔'' وہ جس پُراسرار انداز میں آیا تھا اسی انداز میں لوٹ گیا۔

میں نے ڈنڈا سنبھال کر آگے قدم بڑھایا تبھی ایک مرمریں مجسمہ میرے سامنے نمودار ہوا اور اس کی نقرئی آواز ابھری۔ ''آسمان کے رہنے والے سچائی کے ساتھی ہوتے ہیں میں دیوی کمکھیا ہوں اور یہ سرخ پتھر تمہاری ملکیت ہے جو بالآخر شیام کی موت بن جائے گا۔'' اس نے ایک چمکدار سرخ پتھر میرے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ نقرئی آواز پھر سنائی دی۔ ''اس کے جادو کی ہزار راتیں پوری ہو چکی ہیں اور وہ غافل ہے۔ وہ ان دنوں کا حساب بھول گیا ہے۔ جا آسمان والا جو سب کا ملک ہے تیری حفاظت کرے گا اور اسے موت دے گا۔'' اس کا مرمریں پیکر فضاؤں میں تحلیل ہو گیا۔

میں اس سرخ پتھر کو ہاتھ میں لیے حیران کھڑا تھا۔ نہ جانے کیوں مجھے اپنے وجود میں ایک بے خوفی کا احساس ہوا یوں لگا تھا جیسے اب میرے لیے کامیابی ہی کامیابی ہے۔ تاریکی میں' میں ان پہاڑوں کی جانب تیزی سے سفر کر رہا تھا اور تھوڑی دیر کے بعد میں اس ہیبت ناک اندھیرے میں داخل ہو گیا۔ وہ چشمہ جس کے بارے میں سردار نے مجھے بتایا تھا سامنے ہی موجود تھا اور وہاں ایک تنہا درخت کے نیچے مشعل روشن تھی جس کا علم مجھے پہلے ہی ہو گیا تھا۔ پھر اچانک عقب سے آواز سنائی دی۔

''اے خدا کے بندے' بدی کے مقابل حق کی فتح ہوتی ہے جا خدا تیری حفاظت کرے گا۔''

''آپ کون ہیں؟''

''میں پیر دمڑیا شاہ ہوں اللہ حافظ!'' پھر وہ آواز دور ہوتی چلی گئی۔ دھیرے دھیرے میں اس مشعل کے بالکل قریب پہنچ گیا تبھی کسی کی آواز سنائی دی۔

''آہ میں پیاسا ہوں۔ میں کس قدر پیاسا ہوں کون میری پیاس بجھائے گا کیا تم؟''

وہ اچانک میرے سامنے آ گیا۔ مشعل کی روشنی میں' میں نے اس کی مکروہ شکل دیکھی بڑی

ہیبت ناک شکل تھی سیاہ فام تو تھا ہی نچلا ہونٹ ٹھوڑی تک لٹکا ہوا تھا اور اس کے لمبے لمبے دانت نظر آنے لگے۔ ناک توتے کی چونچ کی طرح مڑی ہوئی تھی۔ بدن اچھا خاصا توانا تھا۔ شیام کو اس سے پہلے بھی دیکھا تھا مگر اس بار وہ کچھ زیادہ ہی ہیبت ناک نظر آ رہا تھا۔

''کیا تُو میری پیاس بجھائے گی۔ مگر تُو تو مرد ہے؟'' اس نے پوچھا اور خود ہی بڑبڑایا۔ ''سردار بڑا ہی عیار ہے اس نے تجھ سے پیچھا چھڑانے کے لیے یہ سوچا۔ خوب کوئی ہرج نہیں ہے مگر تُو کیا پیئے گا۔''

''تیرا خون؟'' میں نے جواب دیا۔

''اوہو ..... اوہو کیا واقعی۔ پی لے' پی لے۔ یہ خنجر لے اور جہاں تیرا دل چاہے گھونپ دے۔'' اس نے ایک لمبا خنجر نکال کر میری طرف بڑھایا۔

میں نے سرخ پتھر کو جیب میں ڈالا اور خنجر کو ہاتھ میں لے لیا پھر میں نے اسے بغور دیکھا ایک لمحے کے لیے میں چکرا کر رہ گیا تھا۔

''بجھا لے اپنی پیاس بجھا لے یا پھر میری پیاس بجھا دے۔'' شیام سینہ کھول کر میرے سامنے آ گیا۔

میں جانتا تھا کہ اس پیش کش میں کوئی خاص بات ضرور ہے تاہم میں یہ دیکھنا چاہتا تھا۔ میں نے خنجر پوری قوت سے اس کے سینے میں گھونپ دیا مجھے یوں لگا جیسے میں نے وہ خنجر کسی کاہی میں اتار دیا ہو پھر میں نے اسے نکالا اور اسے کئی بار اس کے بدن میں جگہ جگہ گھونپا لیکن کہیں سے خون کا ایک قطرہ بھی نہ نکلا۔ وہ مکروہ انداز میں ہنس پڑا۔

''اب میں کیا کروں میرے بدن میں خون ہی نہیں ہے۔ اب تو اجازت ہے؟''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا اور خنجر اسے واپس کر دیا اس نے خنجر میرے ہاتھ سے لے لیا پھر اچانک وحشیانہ انداز میں اچھلنا کودنا شروع کر دیا اور پھر انتہائی سفاکی سے وہ خنجر میری گردن میں اتارنے کی کوشش کی لیکن خنجر کی دھار مڑ گئی۔ جس قوت سے وہ میری گردن میں پیوست کیا گیا تھا اس کے تحت اس کا وہ پہلا اور آخری وار ہونا چاہیے تھا لیکن ...... اس نے حیرانی سے مڑے ہوئے خنجر کو دوبارہ دیکھا اور پھر اسے چٹکیوں سے پکڑ کر سیدھا کر دیا۔

اس بار اس نے خنجر میرے سینے میں بھونکا تھا لیکن اس بار خنجر دوبارہ سیدھا ہونے کے قابل بھی نہیں رہا۔

''کیا تیرا بدن پتھر کا ہے؟'' اس نے وحشیانہ انداز میں پوچھا۔

''نہیں شیام بلکہ تیری قوت ختم ہو گئی ہے شاید تُو ان دنوں کا حساب نہیں رکھ سکا ہزار راتیں پوری ہو چکی ہیں اور یہ رات میری ہے۔'' میں نے کہا اور شیام ساکت ہو گیا شاید وہ ان دنوں کا حساب لگا رہا تھا پھر دوسرے ہی لمحے اس نے ایک سمت چھلانگ لگا دی اور ایک غار میں داخل ہو گیا۔ اب میں اس کا پیچھا کیا چھوڑتا۔ میں بھی غار میں داخل ہو گیا تھا۔ بدبو کا ایک شدید بھپکا میری ناک سے ٹکرایا تھا۔ میں نے اسے تلاش کیا لیکن اس کشادہ غار میں وہ مجھے نظر نہ آیا البتہ سامنے ہی ایک اور سرنگ سی موجود تھی۔ کشادہ غار میں دیواروں میں مشعلیں لگی ہوئی تھیں اور ان کی روشنی نہایت بھیانک منظر پیش کر رہی تھی۔

پورے غار میں مردہ جانوروں کے ڈھانچے پڑے ہوئے تھے۔ کہیں کہیں انسانی ڈھانچے بھی موجود تھے جن میں سڑا ہوا گوشت چپکا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ بھی ایسی ہی مکروہ چیزیں بکھری تھیں۔ میں اس سرنگ کی طرف بڑھ گیا اور سرنگ کے دوسرے دہانے پر مجھے ایک اور روشن غار نظر آیا اس غار کی روشنی بہت تیز تھی۔ میں دھڑک اندر داخل ہو گیا۔ یہ غار زیادہ کشادہ نہیں تھا۔ سامنے ہی سفید رنگ کا تخت بچھا ہوا تھا جس میں اعلیٰ درجے کے جواہرات نصب تھے اور ان ہی ہیروں کی روشنی سے غار منور تھا' شیام تخت پر بیٹھا ہوا تھا اس نے پاؤں بھی اوپر اٹھا رکھے تھے اور اسی کے عقب میں ایک کرسی پر رانی بھی بیٹھی ہوئی تھی لیکن اس خوفناک اور دہشت زدہ شکل میں جس میں' میں نے اسے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ جس دن وہ اغوا ہوئی تھی اس کے بعد اسے آج دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک خوفناک مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ شیام کے چہرے پر خوف کے آثار تھے۔

''تم خوف زدہ ہو؟'' میں نے پوچھا مگر انداز طنزیہ تھا۔

''نہیں ہرگز نہیں۔ تم میرا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے بگاڑ کے دیکھ لو میں تم سے اتنا دور ہوں کہ تم ...... تم مجھ تک پہنچ ہی نہیں سکتے میں تم سے ہزاروں میل دور ہوں سمجھے' ہزاروں میل۔'' اس نے کہا۔

''تم شاید پاگل بھی ہو گئے ہو مجھے ہلاک کرو۔ آؤ' میرا خون پیو' تم پیاسے ہو نا!'' میں نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

''دھوکا ہو گیا ہے دیکھ لوں گا سردار کو' دیکھ لوں گا بستی والوں کو' پوری بستی کا خون نہ پی

جاؤں تو نام نہیں۔ اس نے تمہیں کیوں بھیجا؟ اب اس کے لیے مصیبتیں ہی مصیبتیں ہیں۔'' شیام نے کہا۔

میں بدستور آگے بڑھ رہا تھا اور ایک لمحے میں مجھے انوکھا احساس ہوا میرے اور شیام کے درمیان جتنا فاصلہ تھا وہ تو چند قدموں میں طے ہو جانا چاہیے تھا۔ میں مسلسل آگے بڑھتا رہا تھا لیکن فاصلہ جوں کا توں تھا۔ ایک لمحے کے لیے میں ٹھٹک گیا اور اسی وقت بدبخت شیام نے قہقہہ لگایا۔

''آؤ آؤ رک کیوں گئے۔ مجھ تک پہنچنے کی کوشش کرو تم یہ فاصلہ ساری زندگی طے نہیں کر سکو گے آؤ بڑھتے رہو۔''

لیکن میں وہیں رک گیا۔ یہ صورت حال تعجب خیز تھی اور شیام کو یہ احساس ہو گیا تھا کہ یہاں میں ناکام رہا ہوں۔ چنانچہ اس کا خوف آہستہ آہستہ دور ہوتا جا رہا تھا۔

اس نے پاؤں زمین پر نہیں رکھے تھے اور اسی طرح بیٹھا ہوا تھا۔ پھر اس نے کہا۔ ''یہ تخت میری آخری پناہ گاہ ہے جب تک میرے پاؤں اوپر رہیں گے تُو مجھ تک نہیں پہنچ سکے گا۔''

''بس شیام یہیں تک تیری اڑان تھی۔ تُو نے رانی کو اغوا کر کے خود اپنے گرد موت کا جال بن لیا۔ شاید تجھے علم نہیں خداوند کریم شیطان کو ڈھیل دیتا ہے تو اسے شکست دینے کے لیے برگزیدہ بندوں کی فوج بھی تیار کر دیتا ہے۔ بھلے ہی میں برگزیدہ نہ صحیح مگر اللہ کا بندہ تو ہوں۔ اس کی واحدنیت پر مکمل بھروسا رکھتا ہوں۔''

''سن تجھے تو میں ایسی موت ماروں گا کہ دنیا عبرت حاصل کرے گی۔ تجھے اتنا سمجھایا کہ چلا جا۔ لوٹ جا۔ تیرا پاکستان تجھے بلا رہا ہے مگر تجھے تو یہیں مرنا تھا اسی لیے تُو نے میرا کہا نہیں مانا۔ اب مرتا کہ تیری روح یہیں بھٹکتی رہے۔''

''تُو بھی سن! شداد و نمرود نے بھی یہی کہا تھا کہ خدا کی خدائی کیا ہے' میں تو خود خدا ہوں۔ خود تمہارے دھرم میں بھی ایک کہانی ہے راون کی' اس نے بھی تو تمہارے اچھائی کے دیوتا رام کے خلاف ہتھیار اٹھایا تھا اس کا انجام کیا ہوا؟ وہی انجام اب تیرا ہو گا۔''

''مر گئے مجھ کو مارنے والے۔''

''تم یہ سمجھ رہے ہوناں کہ تم تے انگوٹھی چھین لی ہے تو کامیاب ہو گئے ہو۔''

انگوٹھی کا نام سنتے ہی وہ ایسے اچھلا جیسے اسے بچھو نے ڈنک مارا ہو۔ وہ تقریباً چیختے ہوئے بولا۔ ''میں تو بھول ہی گیا......وہ......وہ......''

''تُو اب بھاگ نہیں سکتا' تیرے گرد میں نے پیر دمڑیا شاہ کا دیا ہوا نقش رکھ دیا ہے اگر بھاگ سکتا ہے تو بھاگ مگر یاد رکھ آتے وقت پیر دمڑیا شاہ نے یہ ڈنڈا دیا تھا جو تیری موت ہے۔'' کہہ کر میں نے وہ ڈنڈا اچھال دیا۔ حیرت انگیز طور پر وہ تمام رکاوٹ دور کرتا ہوا سیدھے جا کر اس پر گرا اور اس بدذات کے جسم سے شعلے اٹھنے لگے۔

اس کے جلتے ہوئے جسم پر میں نے آخری نگاہ ڈالی اور پھر میں نے رانی کا ہاتھ پکڑا اور باہر نکل آیا۔

اس غار سے باہر آتے ہی میری آنکھیں چندھیا گئیں۔ اندھیرے سے تیز روشنی میں آ جانے سے ایسا ہی تو ہوتا ہے۔

کچھ دیر بعد جب آنکھیں روشنی کی عادی ہوئیں تو میں حیرت زدہ رہ گیا۔ میری عقل ماؤف ہو کر رہ گئی۔ یہ وہ جگہ تو نہ تھی جہاں سے میں غار کے اندر داخل ہوا تھا۔ وہ جگہ تو بستی سے کچھ فاصلے پر تھی مگر یہاں تو دور دور تک کسی بستی کے آثار نہیں تھے۔ ہاں کچھ دور ٹیلی فون کے تار نظر آ رہے تھے۔ کھمبوں کی قطار تھی جو دور تک چلی گئی تھی۔ میں اسی طرف بڑھتا چلا گیا۔

ابھی بہ مشکل ڈیڑھ فرلانگ کا فاصلہ طے کیا تھا کہ پیچھے سے کسی نے پکارا۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ جہاں سے ہم چلے تھے اس کے دائیں طرف ایک پگڈنڈی تھی جو پہاڑ سے نیچے آ رہی تھی۔ اس پگڈنڈی پر دھرم سنگھ دوڑتا چلا آ رہا تھا۔

نزدیک آتے ہی اس نے کہا۔ ''اوئے یارا تُو کہاں چھپ گیا تھا۔ تجھے کتنا ڈھونڈا......صبح سے مارا مارا پھر رہا ہوں مگر کوئی بندہ بشر نہیں ملا کہ میں اس سے پوچھتا کہ تم سے کہاں ملاقات ہو گی ایک مکروہ شکل والے نے مجھے جنگل میں بھٹکا دیا تھا۔ خیر یہ رانی تجھے کہاں ملی؟''

''لمبی کہانی ہے بس یہ سمجھ لے کہ شیام کا نام و نشان مٹ گیا' یہ بتا اب تُو کہاں جائے گا؟''

''کیا انگوٹھی مل گئی؟''

"یہ دیکھو!" کہہ کر میں نے ہاتھ پھیلا دیے پھر بولا "اور وہ حویلی بھی بدروحوں سے پاک ہوگئی ہے۔ دمڑیا پیر نے کہا ہے کہ وہ خود مکمل صفائی کریں گے۔ گویا یہاں کا تمام کام ختم ہو چکا ہے۔ اب مجھے واپس جانا ہے۔"

"تو تُو پاکستان لوٹ جائے گا؟"

"اور کیا؟"

"مگر میں ایسا نہیں چاہتا۔ تو پاکستان جائے گا بھلے چلا جا مگر یہ تو سوچ میرا اور رانی کا کیا ہوگا؟"

"تم دونوں کی شادی ہوگی پھر بچے ہوں گے' مجھے چچا چچا کہیں گے کہانیاں سننے کی فرمائش کریں گے اور تب میں انہیں تیری دھرم کہانی سنا دوں گا۔"

"اے میں اس سے شادی نہیں کرنے کی۔" رانی نے مسکرا کر کہا تو دھرم سنگھ کا چہرہ اتر گیا تب وہ قدرے بلند آواز میں بولی۔ "ہاں یہ مجھ سے شادی کر سکتا ہے۔"

دھرم سنگھ کا چہرہ پھر سے کھل اٹھا۔

ہم تینوں واپس بھاگل پور آئے اور وہیں کے گردوارے میں ان دونوں کی شادی کرادی۔ شادی کے بعد میں انہیں خود رانی کے باپ کے پاس لے گیا۔ کرتار سنگھ پہلے تو غصہ ہوا مگر جب اس نے نوادرات کا وہ ڈھیر دیکھا جو میں نے اپنی حویلی کے تہہ خانے سے نکال کر اسے دیا تھا تو وہ خوش ہو اٹھا۔ دو دن تک میں ان لوگوں کے ساتھ رہا پھر میں اپنے بزرگوں کے تحائف کے ہمراہ وطن لوٹ آیا۔ آتے وقت میرا دل پھٹ رہا تھا کیوں کہ دھرم سنگھ حد سے زیادہ رنجیدہ دکھائی دے رہا تھا۔

سب سے زیادہ غم زدہ منصور اور اس کے گھر والے تھے۔ وہ سب اس طرح دہاڑیں مار مار کر رو رہے تھے جیسے کسی کی موت ہوگئی ہو۔ منصور کی امی نے آنسوؤں کی چھاؤں میں میرے بازو پر امام ضامن باندھا تھا پھر بولی تھیں۔ "بیٹا تم لوگ تو جنت میں رہتے ہو تمہیں کیا خبر کہ ہم ہندوستانیوں کو مسلمان ہونے کی کیسی کیسی سزائیں دی جاتی ہیں۔ میں چاہتی تھی کہ تم کچھ دن اور رک جاؤ مگر کیا کروں تمہیں روک بھی نہیں سکتی ورنہ یہاں کی حکومت ہمارے پیچھے پڑ جائے گی۔ یہاں تو کتا بھی مرتا ہے تو اس کی موت کا الزام پاکستان پر لگا دیا جاتا ہے۔ کاش ہم پر ڈھائے جانے والے ظلم کا بدلہ وہاں بیٹھے لوگوں میں سے کوئی لے سکتا

مگر جب اخبار دیکھتی ہوں تو دل رو اٹھتا ہے کہ تم لوگ اس جنت نظیر سرزمین سے وفادار نہیں ہو۔ آپس میں ہی دست بہ گریبان رہتے ہو۔ جب وہاں پہنچنا تو میری طرف سے یہ پیغام سب کو دینا کہ خدارا اپنے لیے نہ سہی ہم مظلوموں کے لیے تو آپس میں شیر و شکر رہو۔" وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتی تھیں مگر کہہ نہ سکیں' مجھے بھی خود پر یارا نہ تھا اس لیے جلدی سے سلام کر کے باہر آ گیا۔

آتے وقت میں نے نوادرات میں سے منصور کو بھی حصہ دے دیا تھا تاکہ وہ ان ایام کو کبھی بھلا نہ سکے۔

شیخو پورہ پہنچ کر مجھے ایسا لگنے لگا تھا جیسے میری زندگی میں خلا آ گیا ہے۔ شیخو پورہ کی سادہ زندگی اتنی ہنگامہ خیز زندگی کے بعد بالکل بور لگی اس لیے میں کینیڈا کی شہریت حاصل کر لی۔ یہیں شادی کی اور اب تو میرے تین بچے بھی ہیں۔ بہت خوشحالی ہے مگر جب کبھی وہ اندھیری راتیں' بھیانک دن یاد آ جاتے ہیں تو ایسا لگتا ہے کہ یہ سب کچھ میرے ساتھ نہیں ہوا ہے' کسی اور کے ساتھ ہوا ہے۔ جب مجھے ایسا لگتا ہے تو پھر میرے بچوں کو کب یقین آئے گا کہ یہ سب کچھ میرے ساتھ ہوا ہے اسی لیے میں اپنی کہانی کسی کو سناتا نہیں ہوں' اسی لیے تو اپنا نام بدل کر میں نے یہ کہانی لکھی ہے۔ مگر کیسی ہے یہ بتانا تو آپ کا کام ہے۔

☆====== ختم شد ======☆